

غذائی تحفظ



فکر سلطان

سیریز پنجم: غذائی تحفظ

ڈاکٹر سلطان محمود

کتاب کا سٹیٹس

نمبر شمار	عنوان	کمنٹس
1	کور پیجیز	شامل ہے
2	فہرست مضامین	شامل ہے
3	مضامین کی درجہ بندی	ابھی کرنی ہے
4	مواد کی درستی	فائنل ریویو باقی ہے
5	گرامر اور زبان	غلطیاں باقی لائن کی گئی ہیں
6	گمشدہ مواد	00 فی صد تک مضامین گمشدہ ہیں
7	غلطیوں کی اصلاح	فائنل ریویو باقی ہے
8	سرخیاں (مستقل سطح اور ترتیب)	بہتر کی جاسکتی ہیں
9	خطوط (فوٹس - مستقل مزاجی اور درست استعمال)	تقریباً ٹھیک ہیں
10	حروف کا سائز (عنوانات، سرخیاں، متن)	بہتر کی جاسکتی ہیں
15	رنگ (متن اور ڈیزائن عناصر)	ضرورت نہیں
16	صفحہ نمبرنگ	شامل ہے
17	حاشیے (مستقل اور ترتیب کے مطابق)	ضرورت نہیں
18	سرخی اور پانوشٹ (ہیڈر اور فوٹر)	شامل ہیں
19	ساخت اور ترتیب	تقریباً ٹھیک ہے
20	حوالہ جات	فائنل ریویو کی ضرورت ہے

غذائی تحفظ

(مصنف: ڈاکٹر سلطان محمود)

GHIZAI TAHAFUZ

BY: DR. SULTAN MAHMOOD

ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر
ایکویٹر کنسلٹنسی سروسز (ای سی سی ایس) پرائیویٹ لمیٹڈ

Managing Director

ECOCARE CONSULTANCY SERVICES (ECCS) PVT. LTD.

www.ecocare.pk

سیریز پنجم: غذائی تحفظ

فکرِ سلطان

(مصنف: ڈاکٹر سلطان محمود)

FIKAR-E-SULTAN

BY: DR. SULTAN MAHMOOD

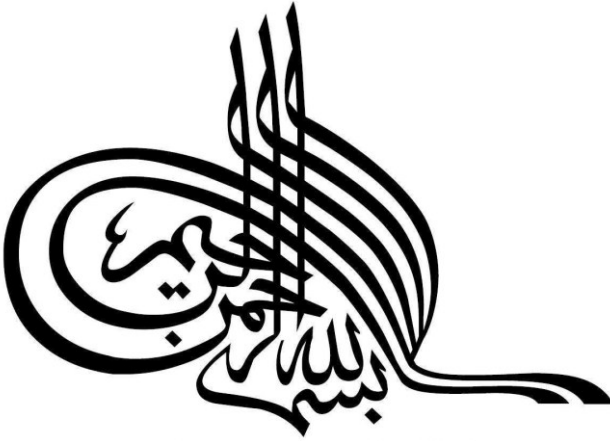
ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر
ایکویٹر کنسلٹنسی سروسز (ای سی سی ایس) پرائیویٹ لمیٹڈ

Managing Director

ECOCARE CONSULTANCY SERVICES (ECCS) PVT. LTD.

www.ecocare.pk

سیریز پنجم: غذائی تحفظ



*In the name of Allah,
the Most Beneficent,
the Most Merciful*

انتساب

Dedicated to the one I love in the
Quest of truth.

میری فکر اس کے نام جس سے میں سچ کی تلاش میں آج بھی پیار
کرتا ہوں۔

فکرِ سلطان: جملہ حقوق

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں	
فکرِ سلطان (10 سیریز)	سیریز
ڈاکٹر سلطان محمود	مصنف
ایجوکیٹر کنسلٹنسی سروسز (ای سی ایس ایس) پرائیویٹ لمیٹڈ	ناشر
مارول سٹم	پبلیشر
انعم عروج	نظر ثانی
2024	اشاعت

فکرِ سلطان: فہرست سیریز

نمبر شمار	عنوان	کل کتب
1	سیریز اول: ہڈ بیتی	12
2	سیریز دوم: غذا اور صحت	30
3	سیریز سوم: حیوانات برائے انسانی غذا	13
4	سیریز چہارم: ماحول و موسمی تبدیلی	31
5	سیریز پنجم: غذائی تحفظ	06
6	سیریز ششم: دیہی ترقی	01
7	سیریز ہفتم: سماجی رویے	04
8	سیریز ہشتم: طنز و مزاح	10
9	سیریز نہم: شعر و شاعری	02
10	سیریز دہم: تصویری مسافت	01
--	کل کتب	110

تعارف: فکرِ سلطان سیریز

ڈاکٹر سلطان محمود نے اپنی نصف صدی کی کاوش کو سائنسی انداز میں تحریر کی کارکن بن کر چلایا نیز غذائی تحفظ ایک کی عالمی خود مختار تحریک کو مقامی رہنما کے طور پر پاکستان میں ایک غیر معمولی موڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں ان کے افکار اور عملی جدوجہد نے 'فکرِ سلطان' جیسی ایک طاقتور دستاویزی سیریز جنم دی ہے۔ اس میں وہ اپنی آدھی صدی کی شبانہ روز کی ہمہ جہت کوشش کو شاندار کہانی کے طور پر بیان کرتے ہوئے اہم معلومات سے بھری وہ تاریخ بھی بیان کر رہے ہیں جو ملک عزیز کے غیر مستحکم حالات کے باوجود مقامی اور خلی سطح کے مسائل کو قومی اور عالمی سطح پر کچھ اس انداز سے اٹھالے جاتے ہیں کہ جہاں وہ حیاتیاتی تنوع یا بائیو ڈائیورسٹی کی ہیئت تبدیل کئے بغیر کارپوریٹ تسلط کے ساتھ جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ڈویلپمنٹ مافیا کے خلاف کس طرح خلی سطح کی لڑائی کو اٹھا کر قومی اور عالمی سطح پر لے جایا جاتا ہے۔ ان کی یہ سوچ بھی قابل داد ہے کہ دنیا بھر میں مقامی سطح کی کمیونٹی ہمیشہ مقدس اور خود مختار ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے علم اور حقوق کو حاصل کر کے مستقبل کی دنیا کی حقیقی کہانی کا نقشہ ترتیب دے سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ سفر مندرجہ ذیل دس سیریز پر مشتمل ہے۔

سیریز اول: ہڈ بیتی

ایک شاندار اور سمجھدار دماغ، شفاف کردار، شاعرانہ روح اور چلی سطح کی تنظیموں میں مہارت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ڈاکٹر سلطان محمود نے ملکی ترقی کے مسائل اور تحریکوں کے سب سے زیادہ موثر اور محبوب لیڈروں کے جھرمٹ میں اپنا مقام حاصل کیا ہے۔ ان کو ملے غیر معمولی قدرتی تحائف میں ایشیا، یورپ، امریکہ، تین براعظموں کی سات جامعات سے حاصل شدہ اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت کی بنیاد پر انسان کی غذائی ضروریات اور قدرتی ماحول کے درمیان گہرے تعلق کا ادراک ہے۔ غذائے انسانی میں استعمال ہونے والی مویشیوں، ماحولیات اور انسانی صحت کے بارے میں وہ آزادانہ گہری تفہیم بھی شامل ہے جو ملکی رویوں کی زبوں حالی کے باعث ہمیشہ زوال پذیر رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مطلق العنان سیاسی اور پدر سری نظام سے کس طرح کی حکمت سے جنگ لڑ کر جیتی جاتی ہے اور کیسے انسانیت اور تخلیق دونوں کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ نیز اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے ایک عام سے متوسط گھرانے سے اٹھ کر 17 سے زائد ممالک میں اپنی صلاحیتوں کا کیسے لوہا منوایا۔ یہ قاری کو ان کی زندگی کے سفر کو پڑھ کر ہی اندازہ ہوگا کہ محدود مالی وسائل سے کوئی بھی لمحہ فروغ گذاشت نہ کرتے ہوئے کیسے، "تبدیلی کا ڈھانچہ بنایا جاسکتا ہے"۔

سیریز دوم: غذا اور صحت

غذائی علاج جیسی اپنی پچھلی مشہور کتابوں کی طرح، مصنف ماحولیاتی حکمت، پر جوش سرگرمی اور بے عیب پیشہ ورانہ سوچ کے ساتھ پھر سے چمک رہا ہے۔ اس سیریز میں مصنف کی نگارشات اس بات کا ثبوت دیتے دکھائی دیتی ہیں جو انسانی خوراک و غذا پر موسمیاتی تبدیلی کے برے اثرات کو کم کرنے کے لیے مقامی اور بین الاقوامی کارپوریٹ سطح کی کوششوں کے لیے کیے جانے ضروری ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مصنف نے کس طرح حیاتیاتی تنوع کے تحفظ اور کسان برادریوں کے حقوق کے لیے اپنی کوششوں کو حوصلے کے ساتھ جاری رکھا۔ مصنف نے 1997 میں غذا و صحت کے میدان میں چھلانگ لگائی اور پھر اسے اس وقت تک اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا جب تک کہ ورلڈ بینک کے راشد القیوم مرحوم کے مشورے کے پیش نظر ڈاکٹر بیٹ کے بارہ برس بعد پنجاب یونیورسٹی سے ماحولیات کی ڈگری نہیں لے لی۔ اور پھر انسانی غذا کی پیداوار پر ماحول کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لینا نہیں شروع کر دیا۔

سیریز سوم: حیوانات برائے انسانی غذا

غذائی تحفظ کی تحقیقی سائنس تقاضہ کرتی ہے کہ پیچیدہ سائنسی و معاشی معاملات کو ان کی سادہ ترین اشکال میں ڈھال کر انسانی مسائل کو آسان تر بنایا جاسکے۔ تحقیقی سائنس کے تنقیدی اظہار یے جیسا شدید پس منظر رکھنے والا ڈاکٹر سلطان محمود چلی سطح کی متعدد انجمنوں اور تحریکوں کا ایک سنسنی خیز موجد، شریک موجد اور کٹر حمایتی بھی رہا ہے۔ نیز افزائش حیوانات، جنگلات، پانی اور کسان تنظیموں کے تحفظ کی ان تمام ضروری تحریکوں کا روح رواں بھی ہے جو زندہ زرعی معاشرے کا تانا بانا ہیں۔ اور یقین رکھتا ہے کہ اس تانے بانے سے انسانی دنیا کا اہم ترین مسئلہ یعنی بھوک سے نجات والا کپڑا بنایا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کو حصول میں اس کی جس مضمون نے سب سے زیادہ رہنمائی کی وہ ان کے گریجویٹیشن کے مضامین تھے۔ جنہوں نے انسانی غذا میں شامل چالیس فی صد جزو حیوانات سے حاصل ہوتا ہے، اس کا ادراک گہرا کیا۔ گوشت، دودھ اور انڈے کی پیداوار اور پھر متناسب پیداوار انسان کو بھوک کے ایسے سے دوچار نہیں ہونے دیتی۔

سیریز چہارم: ماحول و موسمی تبدیلی

ڈاکٹر سلطان محمود کی زندگی کی کہانی ماحولیات، سماجی سیٹ اپ اور گورنگ سنٹی کو بچانے کی جدوجہد کی وہ زندہ مثال ہے جس میں نصابی اور زمینی حقائق دونوں کام آئے۔ وہ اپنے سیارے کے ماحولیاتی نظام کے کام اور ضرر رساں کارٹیل اور اس کے حامیوں کے تباہ کن اثرات کو گہرائی سے سمجھتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنا ان گہرے مسائل کے اسباب کے بارے میں قاری کے ذہن کو کھولے گا جس میں چند لوگ اپنے برے اعمال کی وجہ سے اکثریت کو دھکیل رہے ہیں نیز اس کے مطالعے سے قاری کو حکومت کے طاقتور تکبر سے نکل کر کسان کی طرف پلٹنے کی امید اور حوصلہ ملے گا۔ یہ خوبصورتی سے لکھی گئی یادداشت ایک زبردست داستان ہے جو زمین، زندگی اور ہمارے قیمتی سیارے کی سالمیت کی خواہش رکھنے والے ہر فرد کو پتا ہونی چاہیے۔ مغربی کارپوریٹ سیکٹر کے ESG کی جانب کاروباری جھکاؤ سے مصنف نے جو کچھ امریکہ، یورپ اور خلیجی ممالک سے سمجھا، وہ اس نے اپنے ایکو کیئر بزنس اور سوشل میڈیا آگاہی والے گروپس اور چینل کے ذریعے آنے والی نسل کو پوری طرح سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس سیریز کا 30 کتب کی شکل میں مخطوطہ بڑی تفصیل سے واضح کرتا ہے کہ جو نہی ملک کو کارپوریٹ کلچر کے ذریعے ترقی کی جانب غیر متوازن انداز میں دھکیلا جاتا ہے تو وہ کس طرح ہمارے مجموعی سماجی ڈھانچے کو متاثر کرتا ہے۔ اس سے ملک میں ایک غیر متوازن ماحولیات اور سماجی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ جو بالآخر وسائل کی نامنصفانہ تقسیم پر منتج

ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تئیں تمام ماحولیاتی پراجیکٹس میں قابل کاشت زمین، انسانی روزگار اور گرم ہوتے ہوئے کرہء زمین کے باعث گلشیر پگھل کر طوفانی انداز اختیار کرنے جیسے مضامین کو کافی گہرائی سے دیکھا ہے۔ نیز اس سیکٹر میں پورا جذب ہونے کے لیے اپنی سرکاری نوکری سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر نیپاک جیسی قومی و عالمی ایجنسیوں کے ماحولیاتی پروگرام کا جارحانہ حصہ بن کر انسانی غذا کی تخفیفی سائنس سے بھرپور کام لیا ہے اور چار سو سے زائد ماحولیات پراجیکٹس کو کامیابی سے ہمکنار کر کے ملک کے عوام اور حکومت کے کام کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔

سیریز پنجم: غذائی تحفظ

ڈاکٹر سلطان محمود کی ذاتی کاوشوں کا سارا انچوڑ صرف "غذائی تحفظ" کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔ جسے اصولی طور پر اولین سیریز میں جگہ ملنی چاہیے تھی، لیکن تخفیفی سائنس کا خوگر ہونے کے باعث انہوں نے مناسب جانا کہ پہلے ان ادا امر کا ذکر کیا جائے جو غذائی تحفظ یا عدم تحفظ کا باعث بنتے ہیں۔ تبھی انہیں نے اپنے فکری سفر کا آغاز اپنے پسندیدہ مضمون (سیریز دوم غذا و صحت) سے شروع کرنا مناسب جانا اور انسانی صحت پر غذا کی ضروریات اور اثرات کا شروع میں جائزہ پیش کر دیا۔ یعنی

بالفاظ دیگر اپنی فکر کی بنیاد انسانی جبلت بھوک پر رکھی۔ پھر مناسب انسانی صحت برقرار رکھنے کے لیے مناسب غذا کی پیداوار، سپلائی چین، قوت خرید اور جسمانی ضروریات پر رکھی۔ دھیرے دھیرے اس تخیل کو راسخ کر لینے کے بعد وہ اپنے بنیادی مضمون یعنی ان حیوانات کی جانب پلٹے جو انسانی خوراک میں دودھ، گوشت اور انڈے کی شکل میں روزانہ کی ضرورت کا چالیس فی صد پر مشتمل ہے۔ اس منطقی تعلق سے ان کی فکری گہرائی کا اندازہ لگانا چند اں مشکل نہیں کہ اگر بہترین اور مناسب ماحولیاتی انتظامات کر کے پانی کے ذرائع پر بحث مکمل کر لی جائے تو یہ غذائی تحفظ کی ایک ایسی گارنٹی ہے جو افزائش حیوانات کے ذریعے انسانی صحت کی ضامن ہے۔ یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شدید سیلاب ہر سال جو حیوانات کی تباہی لاتے ہیں ان پر موثر قابو پا کر انسان کم سے کم چالیس فی صد غذائی ضروریات کو تو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ ان کی یہ منطقی سوچ یورپ اور امریکن جامعات کی فلاحی سائنسیز پر کام کر کے پیدا ہوئی۔ گو کہ ڈاکٹر سلطان محمود کے تیکسی کام میں سب سے کم کتب اسی غذائی تحفظ سیریز کا حصہ بنیں لیکن حقیقت بھی یہی ہے کہ عظیم تحقیقات اور کاوشوں کا خلاصہ ہمیشہ مختصر ہوتا ہے۔

سیریز ششم: دیہی ترقی

ویسے تو حیوانات کی افزائش ایک دیہی موضوع ہے جہاں ہمارا 70 فی صد کسان اپنا خون جلا کر صبح شام انسانی غذائیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے غیر متوازن دیہی ترقی کے میدان کی بجائے ہمیشہ شہری ترقی و سہولیات کو اولیت حاصل رہتی ہے۔ جس نے ایک جانب اگر غذائی عدم تحفظ کا خطرہ مول لے لیا ہے تو دوسری جانب شہر کی طرف نقل مکانی کی عفریت کو بھی جنم دیا ہے۔ ایسے غیر دانشمندانہ حکومتی اقدامات کا نتیجہ ایک ایسی بے ہنگم معاشرتی زندگی کی شکل میں رونما ہوا ہے کہ جس میں حکومت گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسنے والوں کے مسائل کو شہری ترقی کی ناکامی کی شکل میں سہہ رہی ہے اور نہ وہ ان کو خدا ہی مل پارہا ہے اور نہ وصالِ صنم ہو رہا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کو تو خیر چھوڑیں اگر کل کے غریب چین اور بھارت ہی کی مثال لے لیں تو ان کے ہاں غذائی تحفظ شہر و دیہاتی زندگی میں توازن لانے سے ممکن ہوا ہے۔ اور محض بیس برس میں ان دو ممالک کے دو ارب لوگ دن میں ایک کھانے سے دو کھانوں کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان دونوں ممالک نے اپنے آبی ذخائر پر ہزاروں ڈیم بنادیئے ہیں جن سے وہ نہ صرف غذائی تحفظ یعنی بنارہے ہیں بلکہ اپنی توانائی کی ضروریات بھی پوری کر رہے ہیں۔ حالانکہ عالمی موسمی تبدیلیاں ان پر بھی ویسے ہی اثر انداز ہو رہی ہیں جیسے باقی کرہء ارض پر رونما ہوتی ہیں۔

سیریز ہفتم: سماجی رویے

ڈاکٹر سلطان محمود اپنے عالمی ایکسپوژر کے باعث خلیجی ممالک میں رواج پا جانے والے حالیہ شعبہ جات میں ماحولیات سے متصلہ کارپوریٹ سیکٹر کی نئی جہت ای ایس جی سے کافی متاثر ہوئے لہذا انہوں نے ملک عزیز کی اس شعبہ میں لاعلمی کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی کل نگارشات میں سے سوشل اور گورننس کے شعبہ جات کو ماحولیات کی کتب کے علاوہ خود مختار کتابی درجہ دے دیا اور اس کے لئے انہوں نے سیاست، مذہب، تعلیم، آبادی، تکنیکی تربیت، شہری و دیہی ترقی وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر جو کچھ تجربات حاصل کئے تھے اسے اکٹھا کر کے اس سیریز کا حصہ بنا دیا ہے۔ سابقہ اعتبار سے وہ اپنی نگارشات کو حاصل مطالعہ بھی کہتے ہیں، اس مطالعے کا حاصل جو انہوں نے مغرب سے حاصل کیا اور سنجیدہ عملی و علمی سفر کو اپنے وطن میں بھی لاگو کر سکتے ہیں۔ گو کہ وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ "کامن سینس" اتنی بھی کامن نہیں ہوتی "لیکن امید واثق رکھنے ہیں کہ جو نہی عوام خصوصاً گسان میں تعلیمی کمی دور ہوگی، سماج میں لازمی بہتری آئے گی۔

سیریز ہشتم: طنز و مزاح

اس جہت پر ڈاکٹر صاحب ایک اتھارٹی ہیں اور خود اپنے اوپر تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں نے اگر طنز و مزاح کے گڑھ لائلپور یا فیصل آباد میں چوتھائی صدی نہ گزاری ہوتی تو میرے اندر کا اصلاحی جذبہ طنز اور شگفتگی کی شکل میں باہر نہ آتا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اس سیریز میں نہ صرف سب سے زیادہ کتب ہیں جو ایک منفرد انداز میں مقامی و عالمی سیاست، مذاہب، نیز دیگر سماجی موضوعات پر طنزیہ و فکاہیہ انداز میں تخلیق شدہ تاریخ کا شاندار اور متاثر کن عالمی منظر نامہ پیش کرتی ہیں جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنی طنزیہ و فکاہیہ ندرت اظہار کے باعث اسے میٹھا سچ سیریز کا نام دے دیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف مقامی طور پر قلیل مدتی طاقتوں کی سماجی خرابیوں کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست کی خود غرضی کا بھی سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہ سیریز ایک شان اور روشنی کے ساتھ بیٹھار سیاسی، سماجی اور منطقی حل بھی فکاہیہ انداز ہی میں پیش کرتی ہے۔ مصنف نے ملک کے نمایاں مزاح نگار کرئل محمد خان اور ظفر اقبال کی طرز سے متاثر ہو کر مزاح لکھنے کا آغاز گو کہ کالج لائف سے شروع کر دیا تھا مگر اس انداز کو ہمیز تب ملی جب وہ نیویارک میں ممتاز صحافی محسن ظہیر کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "صدائے پاکستان" سے بحیثیت سب ایڈیٹر منسلک ہوئے۔ نیز انہوں نے لاہور کے چند اخبارات میں اپنے

فکاہیہ کالم میٹھا سچ کے نام سے ہی لکھنے شروع کر دیے۔ بقول ڈاکٹر صاحب جگت بازی اور فکاہیہ انداز بیان میراثی کو حکومت سے جدا کرتا ہے۔ اور طنزیہ ادب کو سنجیدہ کرتا ہے۔

سیریزِ نہم: شعر و شاعری

ڈاکٹر سلطان محمود کا بچپن ہی سے شاعرانہ مزاج ہے جسے اظہار کا موقعہ کالج لائف میں کسی ناکام محبت کے جھٹکے سے ملا۔ وہ اپنی جبلت کی افاد طبع سے خود ہی نالاں بھی تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف کبھی کل وقتی شاعر بننا گوارا نہیں کیا بلکہ شاعر کہلوانے سے بھی صاف انکار کرتے ہوئے یہ دلیل اختیار کی کہ میں نے کاغذی شیر بننا کبھی بھی پسند نہیں کیا اور دوسری رکاوٹ ان کی سائنس میں اعلیٰ تعلیم بن گئی جو پاکستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ سے حاصل شدہ تھی جہاں شاعروں کو کارآمد اور قابل استعمال وقت کا دشمن سمجھ کر تنقیدی چھلنیوں سے گزارا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تین چار برس میں عروض سمجھے بغیر سینکڑوں غزلیات کہہ دینا شاید ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" بنی جو عین ناکام عشق کے دوران ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ اپنی ہر نگارش کو بچوں کا سپار دیتے ہیں اس لئے انہیں بعض دوستوں نے کلام شائع کرنے پر قائل کر لیا جن میں عروض کی استاد محترمہ کنیز بتول کھوکھر کا بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی لگ

بھگ ایک کتاب کے مواد کو عروض پر بھی ڈھال دیا اور جہلم کے ایک استاد شاعر کاشف بٹ نے بھی ناقابل تردید مدد کی۔ ڈاکٹر سلطان محمود جب اپنی فکر کو تحریری شکل دینے لگے تو انہیں معاصرین نے بے حد مشکل سے راضی کیا کہ وہ اپنے چالیس برس پرانے کلام کو بھی اپنی تحریر میں شامل کریں۔ یہ شاید ڈاکٹر صاحب کی غلطی یا صرف نظر ہی سمجھا جائے گا کہ وہ بہترین کلام غیر ممالک میں تو اردو کمیونٹی کو تو سناتے رہے لیکن ملک عزیز کے اندرونی حلقوں میں قدم تک نہ رکھا۔ البتہ وہ ہمیشہ اپنے برادر بزرگ ڈاکٹر حسن اختر مرحوم، استاد پروفیسر عظمت اللہ خان مرحوم اور دیگر ادبی مقربین کا ذکر بہت شوق اور محبت سے کرتے ہیں۔

سیریز وہم: تصویری مسافت

بھلا ہو ورلڈ بینک کا جس نے ڈاکٹر سلطان محمود کو تصویری بنک بنانے کی عادت ڈال دی۔ حالانکہ انہوں نے محض دس برس کی عمر میں جیب خرچ بچا کر کوڈک کا دس روپے کا کیمرہ 1967 میں ہی خرید لیا تھا اور اپنے بھائی ہمایوں شوکت کے واحد جس تحفے کی وہ قدر کرتے تھے وہ اس کا امریکہ سے لایا ہوا کیمرہ یا شیکا 124 تھا۔ ایسے ہی ان کے استعمال میں وارسا پولینڈ میں روسی کیمرے "زینتھ"، جرمن "میٹنس" اور جاپانی "نیکن" کیمرے بھی رہے لیکن پھر ڈیجیٹل کیمروں اور موبائل کیمروں

نے تو انہیں نہال ہی کر دیا۔ ان کے پاس بزرگوں کے علاوہ مشاہیر زمانہ کی بیشمار تصاویر بھی موجود ہیں جو ہر وقت ان کے لیپ ٹاپ اور سیل فونز کی سپیس کھاتی نظر آتی ہیں۔ اس مشکل کے ہاتھوں انہوں نے مجبور ہو کر اور میاں و قارالاسلام کی صلاح لے کر فیصلہ کیا ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی کی تصویریں دسویں سیریز کیس شکل میں بنائیں گے۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
	باب اول: غذا و صحت کے میدان میں	
	خوراک کے عالمی بحران پر سیاست کیوں؟	
	غذائی بحران... ترقی پذیر ممالک کا عالمی استحصال	
	باب دوم: متبادل بیانیہ	
	متبادل بیانیہ	
	چین کی ترقی	
	بڑھتی ہوئی آبادی	
	باب سوم: معجزے کی امید	
	معجزے کی امید	
	غیر ملکی مداخلت	
	مردم شماری میں بلا جواز تاخیر	
	باب چہارم: غذائی تحفظ	
	غذائی عدم تحفظ	
	اقوام متحدہ کا اعلان خوراک	
	غذائی اجناس کا ضیاع	
	بھوک، غربت، بیماری اور قومی سیاست	
	لائسوسٹاک کو فروغ دینے کے محرکات	
	باب پنجم: معیشت	

	وسائل اور مسائل	
	قومی واٹر پالیسی	
	معیشت کی بحالی کا عزم	
	ترقیاتی منصوبوں کی ناکامی	
	خوراک کی قلت ایک عالمگیر مسئلہ	
	زرعی شعبہ کی بد حالی، ذمہ دار کون؟	
	غذا اور تیل کا نیا بحران	
	خوراک کے بحران پر قابو پانا ہو گا	
	باب ہشتم: پانی کا بحران	
	آئندہ جنگ پانی کے مسئلے پر ہو گی پاکستانی بنگلہ دیشی عوام اس کے لیے تیار ہیں؟	
	بارشیں، سیلاب قدرت کا تحفہ	
	کرہ ارض پر صاف پانی کی کمی	
	باب ہفتم: توانائی	
	توانائی بحران کے مضمرات اور زمینی حقائق	
	توانائی کے سستے ذرائع استعمال کرنا ہوں گے	
	یہ ہے امریکی تعاون برائے توانائی	
	توانائی کا بحران مزید سنگین ہو سکتا ہے	
	توانائی بحران کا حل کیا ہے؟	
	باب ہشتم: تعلیم	

	سائنس کی ترقی	
	تعلیمی ایمر جنسی	
	اقبال کا خواب	
	سائنس اور ٹیکنالوجی	
	کشش ثقل لہروں کی موجودگی	
	سپر ہیومن کی تیاری	
	نینو ٹیکنالوجی کا فروغ	
	ترقی کا آسان راستہ	
	معاشرہ کی اصل ترقی کا راز	
	باب نہم: متفرق	
	جنگ کی ضرورت کس لیے؟	
	چین کا ترقیاتی ماڈل	
	زرعی ایمر جنسی کا نفاذ	
	لائوسٹاک کے شعبہ پر توجہ دینے کی ضرورت	
	کارپوریٹ فارمنگ، ایک اور غیر مقبول فیصلہ	
	نئی کارآمد تحقیق	

باب اول

غذا و صحت کے میدان میں

از حکیم احمد سلیمی

خوراک کے عالمی بحران پر سیاست کیوں؟

روزنامہ آواز، 9 جولائی 8002ء، ص 4

دنیا میں کروڑوں افراد اس وقت غذائی اشیاء کی ناقابل برداشت قیمتوں کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ امیر ملکوں میں اس کے اثرات بظاہر بہت کم یا سرے سے محسوس ہی نہیں کیے جاتے لیکن عالمی معیشت پر اس کے خوفناک اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ جن ملکوں کی پسندیدہ خوراک چاول ہے وہاں گزشتہ ایک سال کے دوران اس کی قیمتوں میں دو گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ گندم اور آٹے کی قیمتیں بھی اپنی انتہائی حد کو چھو رہی ہیں۔ غذائی اشیاء کی قلت کے شکار چالیس سے زیادہ ملکوں میں فسادات پھوٹ پڑے ہیں جن میں متعدد ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں۔ چاول اور پھلوں کی قلت پر ہونے والے فسادات کے نتیجے میں ہیٹی کی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا اور دنیا کی کئی حکومتیں غذائی اشیاء کی قلت اور بے پناہ مہنگائی کی وجہ سے شدید دباؤ میں ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک و زراعت کے ایک عہدیدار میکولنس ڈیوف کے مطابق غربت کے شکار ملکوں میں لوگ پہلے سے مر رہے تھے اور اب غذائی اشیاء کی انتہائی قلت کی وجہ سے فاقے کا شکار ہونے والے افراد فطری طور پر چپ چاپ فاقہ زدگی کا تماشا نہیں دیکھیں گے بلکہ وہ اس پر رد عمل بھی ظاہر کریں گے۔

دنیا میں غذا کی قلت کا مسئلہ آخر اتنا سنگین کیوں ہو گیا ہے؟ یہ سچ ہے کہ عالمی معیشت میں غذائی اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور گزشتہ سال سے غذائی اجناس کی طلب عالمی سطح پر بہت تیزی سے بڑھی ہے جس کا ایک اہم سبب چین اور ہندوستان میں متوسط طبقے کے صارفین کی تعداد میں نمایاں اضافہ بتایا جاتا ہے۔ ان دونوں ملکوں میں نئے متوسط طبقے کی تعداد تقریباً 60 کروڑ کی حد کو پہنچ چکی ہے جو امریکہ اور مغربی یورپ کی

مجموعی آبادی کے قریب ہے۔ اجناس کی گرانی کی ایک اور بنیادی وجہ عالمی منڈی میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے سبب مغربی ملکوں کی جانب سے حیاتیاتی ایندھن (بائیو فیول) کی طلب میں اضافہ بھی ہے۔ دنیا کے غربا پر مغربی ملکوں کی اس پر تعیش طلب کا بہت ہی سفاکانہ اثر پڑا ہے۔

غذائی اشیاء کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافے کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے عالمی غذائی پروگرام کو بھی شدید جھٹکا لگا ہے۔ عالمی ادارہ دنیا بھر میں غذائی قلت کے شکار افراد کو جو امداد فراہم کیا کرتا تھا، اسے اپنا پروگرام جاری رکھنے کے لیے اضافی 57 کروڑ 50 لاکھ ڈالر کی ضرورت ہے۔ ورلڈ فوڈ آرگنائزیشن نے کہا ہے کہ دنیا بھر میں غذائی قلت کو فٹک ترین صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے مصر، کیمرون، ہیٹی اور برکینا فاسو میں خون ریز فسادات ہو چکے ہیں اور خطرہ اس بات کا ہے کہ فسادات کا دائرہ ان ملکوں میں بھی پھیل جائے گا جہاں آمدنی کا 50 سے 60 فیصد حصہ غذائی اشیاء کی خریداری میں صرف ہو جاتا ہے۔ عالمی سطح پر غذائی اشیاء کی قلت کے دو اہم ترین اسباب بتائے جاتے ہیں یعنی ہندوستان اور چین جیسی نئی معاشی قوتوں کی جانب سے طلب میں اضافہ اور اجناس سے بائیو فیول کی تیاری، ان کے علاوہ ایک تیسرا اور اہم سبب سیاسی بھی ہے جسے اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ عالمی ماہرین کے مطابق امیر ملکوں نے اپنے صارفین اور کاشت کاروں کو زر مٹائی ادا کر کے غریب ملکوں کے کسانوں کو شدید بد حالی میں مبتلا کر دیا ہے کہ دنیا کے غریب کاشت کار ہر سال امیر ملکوں کے اس سفاکانہ اقدام کے نتیجے میں ایک سو ارب ڈالر کا خسارہ برداشت کر رہے ہیں اور غلے کی پیداوار میں ان کی دلچسپی گھٹتی جا رہی ہے۔

اس صورت حال کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان بیرون ملک سے جو چاول خریدتا ہے اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی جاپانی رہنمایہ چاول خریدنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 2007

میں جاپانی کاشت کاروں نے اپنی ملکی ضرورت سے کہیں زیادہ چاول پیدا کیا تھا لیکن طویل عرصے سے برسرِ اقتدار لبرل ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنے ملک کے اول پیدا کرنے والے روایتی کاشت کاروں کو بیرونی دنیا میں اپنی اضافی فصل فروخت کرنے کی اجازت کبھی نہیں دی۔

اپنے ملک میں چاول کی سالانہ کھپ کا 4 سے 7.2 فیصد بیرون ملک سے درآمد کیا کرے۔ نتیجے کے طور پر گزشتہ سال جاپان میں سات لاکھ 07 ہزار ٹن ایسا چاول بیرون ملک سے درآمد کیا گیا، جس کی نہ تو وہاں ضرورت تھی اور نہ ہی جاپانی انھیں شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ چاول کی اس سیاست کا اگرچہ عالمی غذائی قلت پر بظاہر جھوٹا لیکن نمایاں اثر یہ پڑا ہے کہ پوری دنیا میں چاول کی قیمتیں چڑھ گئی ہیں اور مختلف ممالک میں شدید قلت کے سبب ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ

آرگنائزیشن نے آزاد تجارت کے نام پر جاپان کی چاول منڈی کو کھولنے کا مطالبہ کیا تھا اور مقامی کاشت کاروں کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے حکومت جاپان نے انھیں بھاری زرِ تلافی ادا کی تھی۔ اب جاپان کے علاوہ پڑوسی ملک جنوبی کوریا کی حکومت نے بھی اپنے صارفین کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ اوسط عالمی قیمتوں کے مقابلے میں تین سے چار گنا زیادہ قیمتیں ادا کر کے اپنی اہم ترین غذائی ضرورت چاول کی تھیلیاں خریدیں۔ اندرون ملک اس قسم کی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں کے کسانوں کو چاول کی ان اہم منڈیوں تک رسائی سے روکا جاتا ہے جہاں وہ کم قیمت پر اپنی پیداوار فروخت کے لیے پیش کر کے اپنی غربت دور کر سکتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ جاپان نے جب اپنی منڈی دوسرے ملکوں کے لیے کھولی تو اس سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے ایک اور امیر ملک کے کاشت کار تھے اور وہ ملک امریکہ تھا۔ امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا سے تعلق رکھنے والے کاشت کاروں نے 1995ء سے جاپان کے درآمدی کوٹے کے

نصف حصے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ان امریکی کاشت کاروں کو بھی ان کی حکومت زراعت (سبسڈی) کی مد میں اب تک دو ارب ڈالر سے زیادہ کی رقم ادا کر چکی ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آج کے عالمی غذائی بحران میں دو اہم عوامل بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑے برآمد کنندگان سے برآمدات میں کمی اور دوسری وجہ گلوبل وارمنگ سے ہونے والی موسمیاتی تبدیلیاں ہیں۔

ترقی اہداف کے صدر لیناٹ بیج کے مطابق ترقی پذیر ملکوں کے رہنما اپنے ملکوں میں زراعت کے شعبے میں سرمایہ کاری کو کبھی ترجیح نہیں دیتے، ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ ان کی ضرورتیں بیرون ممالک سے پوری ہوتی رہیں گی لیکن اب خوف ناک غذائی صورت حال کی وجہ سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ 1980ء سے 2003ء کے دور کو ہم ’سستی خوراک کا دور‘ قرار دے سکتے ہیں، یہ خوشگوار دور اب ختم ہو چکا ہے اور نیا مرحلہ غذائی قلت، اجناس کی ہوش ربا گرانی، منڈی کے بحران اور افریقہ کے علاوہ ایشیاء کے مختلف ملکوں میں پھیلنے والی بھوک اور فاقہ کشی سے عبارت ہے، جس کا سلسلہ دراز ہو سکتا ہے۔

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی جانب سے کھلی منڈی کی جو بحث شروع کی گئی تھی اس میں امریکہ اور یورپ کی جانب سے خصوصیت کے ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ملکوں کے درمیان آزادانہ تجارت کو فروغ ملنا چاہئے لیکن اب ’فری مارکیٹ‘ کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ بہت سے ایشیائی ملکوں میں جہاں چاول کی اضافی پیداوار ہوتی ہے، جن میں ہندوستان، ویتنام، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا بھی شامل ہیں، میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اندرون ملک افراط زر کی شرح پر قابو پانے کے لیے اجناس کی برآمد پر پابندیاں عائد کر دیں گے۔ اس پابندی کے نتیجے میں چاول درآمد کرنے

والے ان پڑوسی ملکوں بالخصوص فلپائن، انڈونیشیا اور علاقے کے دیگر ممالک کو بحران کا سامنا ہے۔ پڑوسی کو بھوکا رکھنے کی اس پالیسی کی وجہ سے یقینی طور پر عالمی قیمتوں میں مزید اضافہ ہو گا اور بحران کی شدت بڑھ جائے گی۔ سب سے زیادہ چاول برآمد کرنے والے ملک تھائی لینڈ نے عالمی منڈی میں چاول کی قیمتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اوپیک طرز کی ایک تنظیم کے قیام کی تجویز بھی پیش کی ہے اور اس سلسلے میں اس نے لاؤس، برما، کمبوڈیا اور ویتنام کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اگرچہ بعض حلقوں نے اس تجویز کی مخالفت کی ہے۔

اس صورت حال کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ پیداوار کا بڑا مسئلہ کھڑا ہوا، جسے امیر ملکوں نے اس طرح حل کیا کہ اپنی اضافی پیداوار کو عالمی منڈیوں میں ڈھیر کرنا شروع کر دیا جو اب سے کچھ عرصہ پہلے تک غذائی اشیاء کی قیمتوں کو کسی حد تک نیچے رکھنے میں کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی ایک مثال میکسیکو ہے۔ 1993ء میں جب نارٹھ امریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ (NAFTA) کا معاہدہ عمل میں آیا تو یون ملک زر تلافی کے زور پر کاشت کی جانے والی مکئی کی فصل سے میکسیکو کی منڈیاں بھر گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی سال تک میکسیکو کی اپنی مکئی کی فصل کی قیمتیں 70 فیصد کی حد تک گھٹ گئیں۔ یہی فوائد یورپی شکر افریقی ملکوں کو بھیج کر، کریمین ممالک کو سستا امریکی چاول اور گھانا و کیمرن کو امریکہ اور یورپ سے سستی چکن بھیج کر حاصل کیے گئے۔ اسی کے ساتھ امریکہ اور یورپی یونین نے بھاری محصولات کی دیوار کھڑی کر کے ترقی پذیر دنیا کو اس تجارتی مقابلے سے دور رکھنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔ بعض ماہرین کے مطابق امیر ملکوں کی جانب سے ضرورت مند ملکوں کو غذائی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد بھی اپنی فاضل پیداوار کو ٹھکانے لگانا ہی ہوتا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں یہ بات حیرت انگیز محسوس نہیں ہوتی کہ اس سال موسم سرما میں جب اجناس کی قیمتیں اپنی انتہا کو پہنچیں، جس کا بنیادی سبب بڑھتی ہوئی طلب اور محدود رسد

تھی تو غیر ممالک اپنی فصلوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اس عرصے کے دوران تھائی لینڈ میں چاول کی قیمتیں 280 فیصد بڑھ گئی تھیں۔ رسد میں کمی کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف کھیتوں کی پیداوار کم ہو رہی تھی، موسم نامہربان تھا اور مکئی کی فصل بطور غذا استعمال کرنے کی بجائے حیاتیاتی ایندھن کی تیاری کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ غذائی بحران کے لیے صرف امیر ممالک ہی ذمہ دار نہیں ہیں، بہت سے ایشیائی اور ترقی پذیر دنیا کے دوسرے ملکوں کی حکومتیں بھی اس میں برابر کی شریک ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی تجارتی پالیسیاں بہت ناقص بنائی ہیں اور زرعی شعبے کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا ہے۔ جس کے نتیجے میں ضرورت کے مطابق پیداوار حاصل نہ کی جاسکی۔ ان ملکوں میں آبپاشی کا نظام تباہ ہوتا گیا لیکن انھوں نے اسے ٹھیک کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور یہ سمجھتے رہے کہ غذائی ضرورت بیرون ملک سے پوری کی جاتی رہی گے۔ حد تو یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں چاول کے کھیتوں کو ختم کر کے وہاں نئے نئے شہر بسانے اور کثیر المنزلہ عمارتوں کی تعمیر کے منصوبے بنائے گئے۔ انٹرنیشنل رائس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق ویت نام، تھائی لینڈ اور بنگلہ دیش ہر سال اپنے ہزاروں، لاکھوں ایکڑ کھیت نئے صنعتی شہر بسانے کی غرض سے ضائع کر رہے ہیں۔ ملائیشیا کی حکومت نے اپنے ملک میں پام آئل کے حصول کے لیے پام درختوں کی کاشت پر زیادہ توجہ دی تھی جو مقامی موسم اور جغرافیائی لحاظ سے چاول کے مقابلے میں زیادہ سودمند سمجھے جاتے ہیں اور ان سے زرمبادلہ بھی حاصل ہو سکتا ہے لیکن اب ملک میں شدید غذائی قلت کے بحران کے نتیجے میں جب غذائی اشیاء کی خریداری کے سالانہ اخراجات حد سے زیادہ ہو گئے تو وزیراعظم عبداللہ بدای نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ سارا واک کے علاقے میں چاول کے نئے فارمز کے لیے ایک ارب 30 کروڑ ڈالر کی لاگت سے سکیم شروع کی جائے گی۔ اسی طرح فلپائن جو 19 ویں صدی

سے اب تک چاول درآمد کرنے والا اہم ترین ملک سمجھا جاتا تھا، عالمی منڈی پر انحصار کم کرنے پر غور کر رہا ہے۔

فلپائنی حکومت کی یہ کوشش ہے کہ 2011ء تک وہ چاول کے معاملے میں خود کفیل ہو جائے تاہم اس کے لیے انھیں کیورو بن جیسے مقامات پر بھاری سرمایہ کاری کرنا پڑے گی۔ چین میں گزشتہ کئی برسوں سے کاشت کاروں سے ان کی فصلوں پر ٹیکس وصول کیا جاتا رہا ہے تاکہ شہروں میں بڑھنے والی آبادیوں کو اس کا فائدہ پہنچایا جاسکے، اب غذائی بحران کی روشنی میں اس نے امریکہ اور یورپ کی پیروی کرتے ہوئے اس سال زرعی شعبے کو 84 ارب ڈالر زرعی زر تلافی دینے کا فیصلہ کیا ہے جو گزشتہ سال کے مقابلے میں 32 فیصد زیادہ ہے۔ چین کے وہ کاشت کار جو پہلے زمین چھن جانے کے خوف کی وجہ سے کاشت کاری میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے اب سرکاری حوصلہ افزائی کے نتیجے میں فصلیں کاشت کرنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ہندوستان میں ایک کروڑ 80 لاکھ ایسے غریب گھرانے ہیں جو کھیتوں میں معمولی معاوضے پر کام کرتے ہیں۔ ان کی حالت میں بہتری لانے کے لیے حکومت ہند بھی چین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھیں کاشت کاری کی جانب پوری لگن کے ساتھ مائل کرنے کے لیے مراعات فراہم کر رہی ہے۔

زرعی ماہرین کا یہ دعویٰ ہے کہ ہماری یہ زمین ابھی اتنی بخر نہیں ہوئی کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکے۔ اقتصادی ماہرین کے مطابق غذائی اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتیں قدرت کی جانب سے جاگ جانے کا ایک اشارہ ہے۔ قدرت کے اس انتباہ کو سمجھتے ہوئے سیاست دانوں کو چاہیے کہ وہ کاشت کاروں کو ایسا ماحول فراہم کریں اور انھیں وہ مراعات دیں کہ کھیتوں سے حقیقی پیداوار حاصل کرنے میں وہ دلچسپی لے سکیں۔ انھیں چاہئے کہ سرخ فیتے کا خاتمہ کرتے

ہوئے مقابلے کی تجارت میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں تاکہ ایسے حالات پیدا ہوں کہ زرعی شعبے میں سرمایہ کاری ان حصوں تک پہنچ سکے جہاں ان کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ غذائی بحران کا ایک خوشگوار پہلو یہ سامنے آیا ہے کہ جب سے خوردنی اشیاء کی قیمتیں چڑھی ہیں، افریقی اور دیگر غریب ممالک نے آپس میں ایک دوسرے کی درآمدی اشیاء کے محصولات میں کمی کر دی ہے جس سے پیداوار بڑھ رہی ہے۔ دوسری اچھی پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ یورپی یونین 1990ء کی دہائی میں برآمدی زرعی اشیاء پر 15 ارب یورو کی زر تلافی کو گھٹا کر گزشتہ سال اسے تین ارب یورو کی سطح پر لے آئی تھی۔ عالمی غذائی بحران کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے زیادہ دل جمعی کے ساتھ زیادہ بہتر اقدامات کرنے کی مزید ضرورت ہے۔ جب تک جاپان کے گوداموں میں ہزاروں، لاکھوں ٹن چاول بے مقصد بھرے رہے ہیں، اس وقت تک عالمی صورت حال تیزی سے تبدیل نہیں ہوگی۔

غذائی بحران... ترقی پذیر ممالک کا عالمی استحصال

روزنامہ آواز، 8 جون، 2008، ص 4

موجودہ حکومت نے جب اقتدار سنبھالا تو عوام کی توقعات آسمان کو چھو رہی تھیں کہ اب پٹرول کی مصنوعات کی بڑھتی ہوئی قیمتوں، اناج کی مہنگائی اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ پر قابو پایا جائے گا۔ سودن کے پروگرام کے اعلان نے امیدوں کو مزید سہارا دیا۔ لیکن سودنوں کی دو تہائی مدت گزر جانے کے بعد بھی پٹرولیم مصنوعات، چاول، گھی، دودھ اور دالوں کی قیمتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا، آٹے کی بدستور قلت اور گرانی جاری رہی اور لوڈ شیڈنگ کے وقفے بڑھتے ہی رہے۔ مبصرین اور ماہرین کے مطابق پٹرول عالمی سطح پر چند کمپنیوں کی اجارہ داری میں ہے بلکہ اس کو اگر کمرشل اولی گار کی (Oligarchy) کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس بے جا عالمی استحصال کو بڑی بڑی حکومتیں خاموشی سے دیکھ رہی ہیں کیونکہ وہ خود بالواسطہ یا بلاواسطہ اس میں ملوث ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان ترقی پذیر ممالک کو پہنچ رہا ہے کہ ان کے مالی وسائل کا بڑا حصہ تیل کی خریداری میں صرف ہو رہا ہے اور ان کے ترقیاتی اخراجات تیزی سے گھٹ رہے ہیں۔ پاکستان بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

جہاں تک خوردنی اشیاء کی گرانی کا تعلق ہے اس میں بھی گلوبلائزیشن اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ انسان کو اپنی کوتاہیوں اور گرین ہاؤس گیسٹر کے تیزی سے اخراج نے عالمی حرارت کے درجوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ کرہ ارض کا سارا ماحول تبدیل ہو رہا ہے۔

صدیوں سے جمے ہوئے گلیشیر تیزی سے پگھل کر سمندر کی سطح کو بلند کر رہے ہیں۔ جنگلات کی بے دریغ کٹائی سے بارش کم ہو رہی ہے یا بے موقع ہو رہی ہے، پانی کا تیز بہاؤ زمین کاٹ رہا ہے۔

توانائی کے شعبے میں کونسلے کا استعمال بڑھ رہا ہے جو گیس پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ دنیا میں غذائی اشیاء کی قلت کوئی نئی چیز نہیں۔ بارش کی کمی یا زیادتی، خشک سالی اور سیلاب، منڈی دل اور دوسرے کیڑوں کی بدولت پیداوار کا طلب سے کم ہو جانا، ایک عام، روایت تھی۔ اس وقت بھی ذخیرہ اندوز اپنی ستم رانیوں سے باز نہیں آتے تھے اور غریب لوگ اپنے بچوں کو فروخت کرتے یا بھوک سے ہلاک ہو جایا کرتے تھے۔ 1946ء میں برصغیر قحط سالی کا شکار ہوا تھا اور اس وقت برما، انڈونیشیا، سیام سے چاول، امریکہ سے گندم، ارجنٹائن سے مکئی اور ترکی وغیرہ سے دالیں منگوا کر راشننگ کے ذریعے ملک میں غلے کی قلت کو پورا رکھا گیا۔ پاکستان میں بھی ایک مدت تک آٹا، شکر اور باسمتی چاول راشن کارڈ کے ذریعے ملا کرتے تھے مگر آج جیسی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی اور نہ سوائے شکر کے آٹے کی بلیک مارکیٹنگ ہوئی۔

اکنامک سروے کے مطابق 70-60 میں گندم، چاول اور مکئی کی کل پیداوار 32 لاکھ ٹن تھی اور فی فرد اناج کا سالانہ اوسط 154 گرام یا 0.12 فیصد گرام روزانہ پڑتا تھا۔ ان اعداد کو محض ایک قیاسی تخمینہ سمجھنا چاہئے جو کل پیداوار کو آبادی پر تقسیم کر کے نکالا گیا، اس میں بیج اور دوسری باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس تخمینے میں گندم کی پیداوار 23.5 ملین ٹن بتائی گئی تھی اور ملکی ضروریات کو 20 ملین ٹن بتا کر 4 لاکھ ٹن گندم برآمد کر دیا گیا۔ بعد ازاں جب پتہ چلا کہ ملک میں گندم کی قلت ہو گئی ہے تو 17 لاکھ ٹن گندم باہر سے منگوائی گئی۔ اگر درآمد کے اعداد درست ہیں تو ملک میں گندم کی ریل پیل ہو جانا چاہئے تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو غلہ نجی گوداموں میں بھر لیا گیا یا بڑے پیمانے پر افغانستان اسمگل کر دیا گیا۔ جب نیا اکنامک سروے آئے گا تو پتہ چلے گا کہ اس سال گندم کی پیداوار کتنی ہے۔ کوئی 21 اور 22 لاکھ ٹن کے درمیان بتاتا ہے اور بعض متعلقہ افراد کے خیال میں پیداوار 20 لاکھ ٹن سے متوازن ہوگی، ہر دو صورتوں میں گندم ملکی ضروریات کے لیے کافی

ہے۔ آسٹریلیا جو گندم کی پیداوار اور برآمد کا ایک بڑا ملک ہے، وہاں کئی سال سے خشک سالی کی بنا پر پیداوار 23 ملین ٹن کے اوسط سے گھٹ کر 13 ملین ٹن رہ گئی۔ 9 ملین ٹن کے تفاوت نے گندم کے بازاروں میں ہلچل مچادی۔ آسٹریلیوی کاشتکار نے نقصان پورا کرنے کی غرض سے قیمت میں اضافہ کر دیا اور مسابقت میں گندم کی قیمت بڑھتی رہی۔ حکومت پاکستان نے گندم کی خریداری کا نرخ 625 روپے فی چالیس کلو مقرر کیا۔ بڑے کاشتکار اس نرخ پر گندم حکومت کو دینے میں ہچکچا رہے ہیں۔ چھوٹے کاشتکاروں میں تو یہ سکت نہیں کہ وہ گندم کا ذخیرہ کریں مگر بڑے زمیندار، آڑھتی اور برآمد کار کاشتکاروں سے گندم خرید کر ذخیرہ کر رہے ہیں اور حکومت کو مطلوبہ گندم نہیں مل رہی، اس کا اندازہ وفاقی وزیر زراعت کے اس اعلان سے ہوتا ہے کہ اگر 48 گھنٹے میں اپنے ذخائر خریداری کے لیے سرکاری اداروں کو پیش نہ کیے گئے تو ذخائر ضبط کر لیے جائیں گے۔ ذخیرہ اندوزی کی نشاندہی کرنے والے کو انعام دیا جائے گا اور نقل و حمل کی سہولت کی خاطر کاشتکاروں کو 100 کلو گرام کے لیے 25 روپے دیے جائیں گے۔ ہدایت تو سخت ہے مگر بے اثر معلوم ہوتی ہے۔ چھاپے مارے جارہے ہیں اور بعض جائز ذخیرہ کو بھی پکڑا جا رہا ہے۔ اس وقت عالمی بازار میں اعلیٰ قسم کا چاول 175

باب دوم متبادل بیانیہ

متبادل بیانیہ

روزنامہ آواز، 15 جنوری، 2019ء، ص 4

مذہبی اعتبار سے باقی سب ممالک غریب ہیں جبکہ بھارت دنیا کا امیر ترین ملک ہے کیونکہ وہاں 20 لاکھ بھگوان ہیں جن کی پوجا کی جاتی ہے۔ (امریکی مزاح نگار مارک ٹوئن)۔

بھارت وہ ملک ہے جہاں ہر مذہب کے لیے گنجائش موجود ہے (برطانوی خاتون مفکر اینی مینٹ)۔

بھارت سے رقابت کا جذبہ ہماری گھٹی میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقابل اور موازنہ کرتے ہوئے بعض اوقات خفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر بھارت میں جمہوری ادارے بہت مضبوط ہیں جبکہ ہمارے ہاں غیر جمہوری قوتیں حالات کی نزاکت کے پیش نظر فریٹ فٹ پر نہ بھی ہوں تو بیک فٹ پر ضرور متحرک و فعال رہتی ہیں۔ بھارت کیا اقتصادی ترقی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں سبقت سمیت کئی ایسے پہلو ہیں جن کے پیش نظر ہم احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں مگر اب ایک ایسا زاویہ سامنے آیا ہے جس میں ہماری انا کی تسکین کا بھرپور سامان دستیاب ہو سکتا ہے۔ بھارت میں ہر سال انڈیا سائنس کانگریس کے نام سے ایک تقریب ہوتی ہے جس کا 106 واں اجلاس 3 تا 7 جنوری کو منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کا افتتاح بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے کیا، یوں تو اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے اعلیٰ پائے کے محققین ہر سال ہی دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن سائنسی ایجادات پر سفید فام اتراتے پھرتے ہیں وہ دراصل قدیم بھارت کے شہہ دماغوں کی ریاضت کا نتیجہ ہیں مگر اس بار کچھ ایسے دعوے کیے گئے جو باسانی ہضم نہیں کیے جاسکتے۔ مثال کے طور پر بھارت کی جنوبی ریاست آندھرا پردیش کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر

نگیشو رراؤ نے انکشاف کیا کہ رمانن میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جس کے پاس 24 قسم کے جہاز تھے اور وہ ان جہازوں کو سری لنکا کے اڈوں پر اتار کر تا تھا۔ اسی طرح تامل ناڈو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کے جے کرشنن نے دعویٰ کیا کہ آنزک نیوٹن اور آئن اسٹائن ایسے نو سر باز ہیں جو ہندوستانی باشندوں کی سائنسی تحقیق لے اڑے۔ اسی لیے انھوں نے مطالبہ کیا کہ دریافت کی گئی کشتی نقل کی لہروں کا نام زرنیرامودی لہریں رکھنا چاہیے۔

دنیا بھر کو چونکا دینے والے یہ انکشافات پہلی بار نہیں کیے گئے بلکہ اس سے قبل انڈیا سائنس کانگریس کے فورم پر کئی ایسے حیران کن دعوے کیے جا چکے ہیں اور بھارتی وزیر گاہے گاہے قوم کو بتاتے رہتے ہیں کہ کس کس بھارتی ایجاد اور دریافت پر ان گوروں نے قبضہ جمار کھا ہے۔ 2014ء میں خود زرنیرامودی نے ایک زبردست انکشاف کیا تھا۔ ممبئی اسپتال کا دورہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ بھگوان گنیش کے دھڑ پر ہاتھی کا سر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ قدیم بھارت میں ہزاروں سال پہلے کاسمیٹک سرجری دریافت ہو چکی تھی۔ ریاست اتر پردیش کے نائب وزیر اعلیٰ ونیش شرما کا کہنا ہے کہ سیتاجی کی پیدائش ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی زندہ مثال ہے کیونکہ انھیں مٹی کے گھڑے سے پیدا کیا گیا اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبل از مسیح کے زمانے میں یہاں ٹیسٹ ٹیوب ٹیکنالوجی موجود تھی۔ ونیش شرما اس سے قبل یہ بھی بتا چکے ہیں کہ گوگل جیسی ٹیکنالوجی قدیم بھارت میں موجود تھی، براہ راست نشریات کا تصور موجود تھا اور صحافت کا آغاز بھی سب سے پہلے بھارت میں ہوا۔ اس سے قبل شمال مشرقی ریاست تری پورہ کے وزیر اعلیٰ سلب کمار دیو بتا چکے ہیں کہ انٹرنیٹ سب سے پہلے ہندوستانیوں نے ایجاد کیا۔ انسانی وسائل اور تعلیم کے وزیر تنپال سنگھ بھی کئی رازوں سے پردہ اٹھا چکے ہیں مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ نیوٹن سے کئی سو سال قبل بھارتی منتری لاء آف موشن، پیش کر چکے تھے۔ رائٹ برادران کے جہاز اڑانے سے 800 سال پہلے ایک

بھارتی سائنس دان شو اکرا باجی تلپڈے جہاز ایجاد کر چکے تھے اور سب سے پہلے طیاروں کا ذکر رامائن میں ملتا ہے۔ راجستھان کے وزیر تعلیم گائے کی سائنسی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ آکسیجن لے کر کاربن ڈائی آکسائیڈ تو تمام حیوان خارج کرتے ہیں مگر گائے وہ مجر العقول جانور ہے جو آکسیجن ہی خارج کرتی ہے۔ راجستھان ہائیکورٹ کے سابق جج مہیش چند شرمہا کے خیال میں تو گائے ایک چلتا پھرتا شفاخانہ ہے جس میں ہر بیماری کا علاج ہے۔ گھروں میں گائے کے گوبر کا لیپ کرنے سے تابکاری سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں کے مصداق بھارت کی حیرت انگیز سائنسی ایجادات اور دریافتوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس حوالے سے کئی محققین نے جانفشانی سے کام کیا ہے۔ ایسے ایسے نابغہ روزگار لوگ موجود ہیں جو ہر ایجاد یا دریافت کے بعد کوئی حوالہ ڈھونڈ لاتے ہیں کہ قرطبہ، طلیطلہ یا پھر اشبیلیہ کی فلاں یونیورسٹی میں فلاں ابن فلاں نے تو یہ نظریہ کئی سو سال پہلے پیش کر دیا تھا۔ ہمارے کئی علماء و محققین اپنی تصانیف میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ جدید سائنسی ایجادات و تحقیق جو آج ہو رہی ہے مسلمان وہ کئی سو سال قبل کر چکے ہیں۔ بھارت کے مقابلے میں سائنس و تحقیق پر ہمارا حق شفعہ کہیں زیادہ مضبوط ہے مثال کے طور پر ہم بتا چکے ہیں کہ رائٹ برادران سے پہلے ابن فرناس نے اڑن کھٹولہ ایجاد کیا۔ گلیلیو سے 500 سال قبل ابن حزم ثابت کر چکے تھے کہ زمین گول ہے۔ ہمارے حق ملکیت کی فہرست بھارت کے مقابلے میں کہیں زیادہ طویل ہے لیکن اس ضمن میں حکومت سرپرستی کرے تو مزید جوش و جذبے کے ساتھ آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ اگر تاریخی واقعات کے حوالے ڈھونڈ کر دعویٰ دائر کر دیا جائے تو کم از کم ان کافروں کی دھوکہ دہی اور فراڈ کو پشت از بام کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں بھی بھارت کے طرز پر سالانہ پاکستان کانگریس کا

انعتقاد ہو اور اس میں جید علماء کرام کے علاوہ ایسے متبادل بیانیے کو فروغ دینے والے دانش ور مدعو کیے جائیں تو یقیناً اُس شعبے میں بہت جلد بھارت کو مات دی جاسکتی ہے۔

چین کی ترقی

چین سے ہمارا لگاؤ خاصا پرانا ہے۔ کبھی ماؤزے ڈونگ نے ہمیں یونیورسٹیاں چھوڑ کر کھیتوں اور فیکٹریوں کے مزدوروں اور کسانوں سے جڑنے پہ ایسا اکسایا تھا کہ ہمیں برسوں واپسی میں لگے۔ ہمارے لیے پاک چین دوستی ایسے وقت میں رومانی ہوئی جب پالتو لوگ امریکہ کے بڑے اتحادیوں میں بڑے ہی اتحادی کہلائے جانے پر بغلیں بجایا کرتے تھے۔ کیسے کیسے شاندار لوگ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر مبشر حسن، میجر اسحاق محمد، افضل بنگش، کنیز فاطمہ، طفیل عباس، معراج محمد خاں، ملک معراج خالد، رسول بخش پلجیو، عزیز الدین احمد، عزیز الحق اس دوستی کا راگ الاپتے تو ہر طرف سے رجعتی و سرکاری لوگ حملہ آور ہوتے اور یہ ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا بھاشانی تھے جنہوں نے چین سے دوستی کو عوامی جلا بخشی۔ اب تو ہر کوئی پاک چین دوستی کا پرچم اٹھائے دیوانہ ہوا جاتا ہے۔ یہ ٹھینک یو امریکہ کہنے والے صالحین بھی اب کسی سے پیچھے کیوں رہنے لگے۔ ایسی ترقی، اتنی ہمہ جہت تو اتنی برق رفتار، اتنی انسان دوست اور اتنے قلیل عرصے میں کبھی تاریخ میں کسی قوم کی تہذیب نے نہیں دیکھی۔ لیکن نہ تکبر اور نہ بڑی ڈینگیں۔ پانچ ہزار سال سے پرانی تہذیب اور آسمانی وسطی سلطنت (زبانگ ہو) کی احیائے نو۔ دور رس نگاہ چینی قیادت بھی کیا کمال کی ہے کہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کی سوویں سالگرہ پر وہ چین کو 2021ء میں ایک جدید اور خوش حال معاشرے میں ایسے بدلنا چاہتی ہے کہ کوئی غربت کا مارا نہ رہے۔ اس فوری ہدف کے ساتھ ساتھ وہ عوامی جمہوریہ چین کے قیام کی 100 ویں سالگرہ پر 2049 تک چین کو ایک آگوا عالمی طاقت بنانے پر کمر بستہ ہے جبکہ 2035 تک چین امریکہ اور یورپ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن چکا ہو گا۔ چینیوں کے پاؤں اپنی زمین اور نگاہیں آسمانوں پر ہیں۔ چین دنیا میں وہ پہلا ملک ہے جس کی مجموعی قومی ترقی (GDP) 2015ء ہی میں کھرب ڈالر کے مساوی ہو چکی تھی۔

اس وقت چین تجارت، بیرون ملک سرمایہ گریازر مبادلہ کے ذخائر کے اعتبار سے اول ہے اور چین دنیا کی سب سے بڑی صنعتی معیشت بن چکا ہے۔ یہ معاشی زقند چین نے تاریخ میں پہلی بار نہیں لگائی۔ گزشتہ اٹھارہ صدیوں تک چین دنیا کا سب سے بڑا پیداواری ملک رہا ہے۔ 1820ء کے اعداد و شمار کے مطابق چین کا دنیا کی پیداوار (GDP) میں حصہ 30 فیصد تھا جو کہ مشرقی و مغربی یورپ اور امریکہ کی مجموعی پیداوار سے زیادہ تھا۔ اگر بیچ میں نو آبادیاتی غلبہ نہ ہو جاتا تو دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن چین کی ترقی کا محور وہی ہے جسے کمیونسٹ پارٹی نے اپنی اساسی دستاویز میں یوں بیان کیا ہے، چینی عوام کی خوشی اور خوشحالی اور چینی قوم کی احيائے نو۔ چینی ترقی کا راز چینی کمیونسٹوں کی عوام کی ترقی کی فلاسفی میں ہے۔ صرف گزشتہ چند سالوں میں چھ کروڑ لوگ غربت سے نجات پا چکے ہیں اور اگلے تین برسوں میں پورے چین سے غربت کا نشان مٹ جائے گا۔ چینی ترقی کے ماڈل کا اصرار یہ ہے کہ "ہمہ طرفہ انسانی ترقی (تعلیم، مہارت، صحت اور تہذیب) اور ہمہ گیر سماجی ترقی"۔

یہ حکومت اس خالص سرمایہ دارانہ اور خالی خولی مذہبی مساوات کے طبقاتی نظریات سے قطعی مختلف ہے جس کا پرچار ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور نیولبرل معیشت دان یا پھر ہمارے بعض مذہبی ٹھیکے دار کرتے ہیں۔ دہائیوں اور صدیوں سے لوگ ترقی کی ان بوندوں کی آس میں لگے ہیں جو کبھی ٹپکنے کو تھیں۔ سوشلزم کا جنازہ نکالنے والوں کے لیے چین کے عوام کا ابتدائی سوشلزم (Primary Stage of Socialism) سے فیض یاب ہونے کا زندہ جاوید تجربہ کسی تازیانے سے کم نہیں اور ابھی تو کمینزم کے اگلے مراحل بھی آنے ہیں پھر دیکھئے سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کو کیسے کیسے دورے پڑتے ہیں اور ہمارے رجعتی کیسے پیترے بدلتے ہیں۔ کوئی آنکھوں سے تعصب کی پٹی نہ اتارے اور اپنی جہالت اور نفرت پر مصر رہے تو اس کی مغفرت ہی کی دعا کی جاسکتی ہے۔ چینی

کمیونسٹ پارٹ مارکسی، لینن فکرِ ماؤزے ڈونگ، ڈنگ ژیاؤ پنگ تھیوری اور اب کامیڈی کے نئے دور میں چینی طرز کے سوشلزم بارے خیالات سے لیس ہے۔

چینی قیادت کا انتخاب طویل کارکردگی پر ہوتا ہے اور صدر رژی کا انتخاب بھی ان کی عوامی اور قومی خدمات کی تصدیق کرتا ہے۔ اب وہ چین میں قانون کی حکمرانی، احتساب، جدت پسندی اور ماحولیاتی تحفظ پر زور دے رہے ہیں۔ چینی کمیونسٹوں نے جس طرح ریاستی کنٹرول اور مارکیٹ میکنزم کو استعمال کیا ہے وہ تاریخی طور پر منفرد ہے اور کٹر عقیدہ پرستی اور خلوت پسندی کی نفی کرتا ہے۔ چینی ماڈل کو سمجھنے اور چین سے شراکت داری کے حوالے سے بہت تحقیقی اور مطالعاتی کام کی ضرورت ہے، جو کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

چینی شطرنج کے کھلاڑی نہیں جن کا سارا زور مہروں کی ماراماری میں حریف کی بات پر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ وی شی (Weiqi) کے کھلاڑی ہیں جس میں حریفوں کی توجہ ہمہ جہت پیش رفتوں پہ ہوتی ہے کہ مات دیے بنامات ہو جاتی ہے۔ یہی ان کا تزویراتی نظریہ بھی ہے۔ وہ کلاؤٹ (Clause wit) کے مغربی حکمت کے نسخوں کے قائل نہیں جس میں سارا زور مرکز ثقل (Centre Gravity of) اور فیصلہ کن نکتے (Decisive Point) پر ہوتا ہے۔ چینوں کا تزویراتی گرو سن زو (Sun) (Tau) ہے جو جنگ کو لڑے بنا جنگ جیتنے کا گر سکھاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے اعلیٰ ترین مہارت، ہر جنگ جیتنے میں نہیں، بلکہ دشمن کو بنا جنگ لڑے شکست دینے میں ہے۔ ہمارے لیے اس میں سیکھنے کے لیے بہت ہے اگر ہم سیکھنے پہ تیار ہوں۔

چین کا عالمی نظریہ بھی ویسا ہی ہے جیسے اس کی اندرونی انسانی بنیاد چینی کمیونسٹ پارٹی کی انیسویں کانگریس نے اعلان کیا ہے کہ چین ایک ایسی عالمی برادری کی تشکیل چاہتا ہے جس کی بنیاد بنی نوع

انسان کے لیے شراکتی مستقبل میں ہو۔ یہ بھی پرانا چینی نظری ہے جو کنفیو شس (فانگ فوزی) نے صدیوں پہلے پیش کیا تھا: 'منصفانہ اور متوازن' (Harmonious) راستہ۔ چین نے کبھی علاقہ گیری نہیں کی۔ وہ دادا گیر ہے نہ کسی کی دادا گیری (Hegemony) کو ماننے والا۔ چینی روایت ہے جو احترام کرے، سو وہ فیض پائے۔ نقل ہنری کسنجر چین نے 'صن سلطنت' (25-220 عیسوی) سے اب تک اپنے ہمسایہ ممالک پر کبھی براہ راست کنٹرول حاصل نہیں کیا اور بربریت پسندوں کے آپس میں گتھم گتھارہنے میں ہی عافیت جانی۔ ابھی تک چین کے کوئی جارحانہ فوجی عزائم نظر نہیں آئے۔ اگر امریکہ کے 120 ملکوں میں 640 فوجی اڈے ہیں تو چین کی صرف ڈبچی بوٹی میں ایک بندرگاہ ہے جو فوجی کم اور تجارتی پولیس چوکی زیادہ ہے۔ چین کا دنیا پر دھاوا معاشی و تجارتی ہے اور منڈی میں مقابلے کا ہے۔ اب گلوبلائزیشن کا لیڈر امریکہ نہیں چین ہے۔ سرمایہ دار دنیا کو چین کے سوشلزم کی شہ مات! اس کا سب سے بڑا اظہار صدر ژو جی جن پنگ نے ون بیلٹ ون روڈ کے عظیم الشان منصوبے کی صورت دیا ہے جو ایشیاء، شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ کو باہم مربوط کرے گا۔ چین پاکستان اکنامک کاریڈر (CPEC) اس کا نہایت جامع ایڈیشن ہے۔ پہلے مرحلے میں توانائی اور انفراسٹرکچر کے منصوبے 27 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے پایہ تکمیل کو پہنچنے کو ہیں جبکہ جوائنٹ کوآپریشن کمیٹی کے حالیہ اجلاس میں طویل المدتی منصوبے کی منظوری دی جا چکی ہے جس کے تحت 10 قومی معاشی خطوں کے علاوہ، گوادریورٹ، پاکستان ریلویز اور کراچی سرکریٹرین کے اہم منصوبوں پر کام ہوگا۔

خوش قسمتی سے پاک چین تعلقات اب تزویراتی اور سلامتی کے دائرے سے بڑھ کر وسیع تر معاشی صنعتی، زرعی اور تکنیکی میدانوں تک پھیل گئے ہیں۔ سی پیک یقیناً ایک گیم چینجر ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم خود کو اس کے لیے تیار کریں۔ ہمیں چین کے عوامی ترقی کے ماڈل اور ہمہ طرفہ ترقی

کے نظریے سے سیکھنا چاہئے۔ اس دوستی کا مقصد مکمل طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی استعداد حاصل کرنے پر ہونا چاہئے، نہ کہ دست نگری کی ایک اور صورت۔ پاکستان کا چین کے ساتھ تجارتی خسارہ ہمارے کرنٹ اکاؤنٹ کے خسارے کے تقریباً برابر ہے اور ہمارے لیے تشویش ناک بھی۔ ہمیں چینی منڈی تک رسائی کے لیے دو طرفہ تجارتی معاہدے پر نظر ثانی کرنی چاہئے لیکن اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ چین یہاں 10 ارب ڈالر سرمایہ کاری کرنے جا رہا ہے جو کہ بے مثال ہے۔ ہمیں چین پاکستان اکنامک کارپوریشن کو جنوبی اور وسطی ایشیاء کو باہم مربوط کرنے اور اپنی قومی و علاقائی ترقی کے بڑھاوے کے لیے بروئے کار لانا چاہئے۔ پاک چین دوستی زندہ باد! چین، چین ہے تو پاکستان کو بھی عظیم الشان بنائیں!

بڑھتی ہوئی آبادی

بھارت آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک بن جائے گا اور یہ چین کو آبادی میں پیچھے چھوڑ جائے گا۔ بھارت ان آٹھ ممالک میں شامل ہے جن کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت چین، بھارت، بنگلہ دیش، پاکستان اور سری لنکا کی مجموعی آبادی باقی دنیا کی مجموعی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ اقوام متحدہ کے پاپولیشن ڈویژن نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ چین میں زیادہ بچے پیدا کرنے کے رجحان میں تبدیلی کے باعث بھارت آبادی کے حوالے سے چین پر سبقت لے جائے گا۔ رپورٹ کے مطابق بھارت کی موجودہ آبادی ایک ارب 19 کروڑ جو 2050ء تک بڑھ کر ایک ارب پچاس کروڑ پینتیس لاکھ ہو جائے گی جبکہ چین کی موجودہ آبادی ایک ارب تہیں کروڑ دس لاکھ سے بڑھ کر ایک ارب میں کروڑ نو لاکھ ہو جائے گی جس کے نتیجے میں بھارت چین سے زیادہ آبادی والا ملک بن جائے گا اور ادھر دنیا کی آبادی جولائی تک ساڑھے 7 ارب تک پہنچ جائے گی۔ ماہرین ارضیات کے مطابق کرہ ارض اندازاً ساڑھے چار ارب سال قبل عالم وجود میں آیا، اس پر حیات کے آثار دو ارب بائیس کروڑ سال پہلے نمودار ہوئے اور زندگی کا باقاعدہ آغاز بائیس کروڑ سال پہلے ہوا۔ اس سلسلے میں مختلف محققین نے متضاد نظریات پیش کیے ہیں۔ پیٹر کاس کے مطابق کرہ ارض پر انسانی زندگی کی ابتدا پانچ لاکھ 50 سال قبل ہوئی تھی لیکن تازہ ترین شواہد کے مطابق اس کرہ ارض پر انسانی زندگی آج سے تقریباً چالیس لاکھ سال پہلے نمودار ہوئی۔ ابتدائی دور میں آبادی بہت کم تھی۔ ایک فرد کو اپنی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دو مربع میل علاقہ درکار تھا۔ اگر اس چیز کو بنیاد بنایا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت انسانی آبادی ایک کروڑ سے زائد نہ تھی۔ اب دنیا کی آبادی جو اقوام متحدہ کے ایک تخمینے کے مطابق 1970ء میں 4.3 ارب تھی، پھر ساڑھے پانچ ارب کے لگ بھگ ہوئی اور جولائی تک

ساڑھے سات ارب کے لگ بھگ ہو جائے گی۔ یوں تو آبادی میں تیز رفتاری سے اضافے کی کئی وجوہات ہیں لیکن بڑی وجہ شرح اموات اور شرح پیدائش کا فرق ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں بہتر طبی سہولتیں میسر ہونے کی بنا پر شرح اموات میں قابل قدر حد تک کمی واقع ہوئی ہے مگر دوسری طرف شرح پیدائش میں اضافہ ہوا ہے۔ برطانوی ماہر آبادی تھامس رابرٹ کے مطابق جس کا ذکر اس نے اپنی کتاب آبادی کے اصول میں کیا ہے کہ اگر کسی ملک کی آبادی ایک فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھے گی تو اسے دو گنا ہونے کے لیے 49 سال کا عرصہ درکار ہو گا۔ دو فیصد آ جانے کی شرح سے 35 سال لگیں گے۔ تین فیصد سالانہ کی شرح سے 23 سال بعد اور اگر آبادی چار فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھے گی تو 17 سال بعد دو گنا ہو جائے گی۔ اس فارمولے کی رو سے برطانیہ کی آبادی 460 سال کے بعد چین کی 57 سال کے بعد پاکستان کی 22 سال اور کینیا کی آبادی کے 17 سال کے بعد دو گنا ہونے جارہی ہے۔ کچھ ماہرین کے مطابق دنیا کی آبادی میں ہر سال آٹھ کروڑ اور کچھ کے بقول ساڑھے آٹھ کروڑ افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ ترقی پذیر ممالک میں بہت نمایاں ہے جبکہ ہر سال اس قدر آبادی کا بوجھ برداشت کرنا ان ممالک کی بساط سے باہر ہے۔ اگر کسی طرح ٹیکنالوجی میں ترقی اور سرمائے میں اضافے کی وجہ سے پیداواری صلاحیتوں میں کچھ بہتری ہو بھی جائے تو بہت کم وقت میں آبادی کا بڑھتا ہوا طوفان اس پر غالب آجاتا ہے جس سے طلب اور رسد میں توازن قائم رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ بعض ترقی پذیر ممالک میں افزائش آبادی کی شرح چار فیصد سالانہ تک ہے لیکن اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں شرح ایک فیصد سے بھی کم ہے جبکہ دنیا کی تقریباً 77 فیصد آبادی ترقی پذیر ممالک میں رہائش پذیر ہے اور ان کے باشندوں کی متوقع عمر اوسطاً 52 سال تک ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک کے باشندے کی اوسط عمر 75 سال سے زائد تک جا پہنچی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں بچوں کی زیادہ تعداد اور کم عمری کی اموات سے اس

حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کمانے والوں اور ان پر انحصار کرنے والوں کی تعداد میں توازن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں طبی سہولتوں کا فقدان ناخواندگی اور دوسری کئی وجوہات ایسی ہیں جن کی وجہ سے شرح اموات بلند ہے۔ دنیا کی آبادی میں اضافہ 97 فیصد ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں ہو رہا ہے۔ افریقی ممالک میں سالانہ اضافہ کی شرح 3 فیصد ہے جبکہ ایشیائی ممالک میں 2.8 فیصد۔ پاکستان میں یہ اضافہ 3.2 فیصد تک جا پہنچا ہے جبکہ برصغیر میں یہ اضافہ مجموعی طور پر 2.3 فیصد ہے۔ مجموعی طور پر ایشیا میں اضافہ آبادی 1.9 فیصد سالانہ ہے جبکہ یورپ میں یہی اضافہ اوسط 0.25 فیصد ہے۔ دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے شہروں میں سات ایشیاء میں ہیں۔ عرب ممالک میں آبادی میں اضافہ وہاں کی شرح با آوری کی زیادتی کی بنا پر ہے جہاں شرح اضافہ تین فیصد سالانہ ہے۔ اس کے برعکس یورپ میں 1465 کے بعد سے خواتین میں کم بچوں کو جنم دینے کے رواج کے باعث یہاں شرح آبادی 0.25 سے کم ہو کر 0.24 تک آگئی ہے جبکہ پاکستان میں یہ شرح 6.6 فی عورت ہے۔ 1960ء کے بعد دنیا میں خاندانی منصوبہ بندی کے طور طریقوں کو اپنانے کا عمل تیز ہوا ہے۔ بیشتر ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی کو ابتدائی صحت کا حصہ بنایا گیا ہے۔ میرے حساب سے خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب محض مانع حمل ادویات یا دوسرے طریقوں کا عام کرنا نہیں بلکہ یہ ایک طرز زندگی اور طرز معاشرت ہے۔ ایک ایسا ماحول مہیا کرنا جہاں سب اس کی افادیت کے قائل ہو سکیں۔ ورنہ آبادی میں اضافہ جہاں قدرتی وسائل کو تیزی سے کھا رہا ہے وہاں انسانی زندگی کے معیار کو بھی گھٹا رہا ہے۔

باب سوم معجزے کی امید

معجزے کی امید

جب بھی گنے کی فصل کا موسم آتا ہے ہمارا کاشتکار اپنی مہینوں کی محنت کا سکون سے پھل کھانے کی بجائے سڑکوں پر احتجاج کر رہا ہوتا ہے۔ یہ تماشا ہر سال ہوتا ہے، سو اس سال بھی ہو رہا ہے۔ فصل پکتے ہی کاشتکار کو معلوم ہوتا ہے کہ شوگر مل مالکان کے ہاتھوں اس کے استحصال کا وقت ہو چاہتا ہے لیکن چند سالوں سے میڈیا کے ذریعے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ حالات میں بہتری آئی ہے۔ اس سال بھی بڑے زور و شور سے عوامی وسائل کے ذریعے تشہیری مہم چلائی گئی اور اخباروں سے معلوم ہوا کہ کاشتکار کو 180 روپے ریٹ مل رہا ہے۔ تھوڑی تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ریٹ صرف اخباروں میں ہی مل رہا ہے۔ وسطی پنجاب کے ایک کاشتکار کی داستان ملاحظہ کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ اخباروں میں ریٹ 180 اور قریبی مل میں 30 روپے ہے۔ اخباروں سے متاثر ہو کر میں نے قریبی مل کی شکایت کر دی تو اس نے میرا گنا خریدنے سے انکار کر دیا۔ دس دن گنے سے بھری ٹرالیاں باہر کھڑی رہیں، ہر روز ٹرائی اور ڈرائیور کا خرچہ اٹھانا پڑا۔ تنگ آکر گنا ساتھ والے ضلع کی مل میں بھیجا لیکن اس مل والوں کو پہلے ہی میری شکایت والی حرکت کے بارے میں بتا دیا گیا تھا، کئی روز تک اس مل والوں نے بھی گنا نہ خریدا۔ بالآخر منت سماجت کرنے پر یہ ملے ہوا کہ ریٹ 128 روپے ہو گا اور 600 من کے پیچھے 50 من کی کٹوتی ہوگی۔ بیچنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، سو وہ گنا بیچ دیا۔ باقی ماندہ گنے کے لیے واپس اپنی قریبی مل والے کی منت سماجت کی، بڑی مشکل سے معافی تلافی ہوئی اور اب گنا اسی کو 130 روپے میں بیچ رہا ہوں۔ چار پانچ دن ٹرائی انتظار کرتی ہے اور کٹوتی 600 من کے پیچھے 90 من۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے، کاشتکار کا کہنا تھا کہ اس ملک میں کاشتکار پس چکا ہے۔ پورا ملک دو نمبری پر چل رہا ہے لیکن کاشتکاری ان بد قسمت پیشوں میں شامل ہے جہاں دو نمبری کی بھی گنجائش نہیں۔ کاروباری لوگ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ٹیکس چوری کی دو نمبری کر لیتے ہیں۔

سرکاری ملازم کرپشن، کام چوری اور سرکاری وسائل کا ذاتی استعمال کر کے دو نمبری کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ریڑھی بان بھی دکھاتا کچھ ہے اور دیتا کچھ ہے لیکن میں ایک کاشتکار ہوں مجھے بتائیں میں کیا دو نمبری کر سکتا ہوں؟ وہ دوبارہ گویا ہوا کہ جب میں فصل تیار کرنے کے لیے بیج، کھاد، اسپرے خریدنے جاتا ہوں تو ہر جگہ میرے ساتھ دو نمبری ہوتی ہے اور جب میں کئی مہینے کی محنت سے فصل تیار کر کے بیچنے جاتا ہوں تو ایک دفعہ پھر آڑھتیوں اور مل مالکان سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ خود بتائیں میں ان لوگوں کے ساتھ کیا دو نمبری کر سکتا ہوں؟ جب میں اپنی کاشتکار کا خام مال خریدنے جاتا ہوں تو کبھی مجھے اشیاء مہنگے داموں ملتی ہیں کبھی دو نمبر لگتی ہیں اور کبھی دکاندار کے نام سے جو ٹیکس جمع ہوتا ہے وہ دراصل مجھ سے وصول ہوتا ہے اور جب میں اپنی فصل بیچنے جاتا ہوں تو کوئی مجھے میری فصل کا ریٹ کم دیتا ہے، کوئی اس میں سے کٹوتی کاٹ لیتا ہے اور کوئی مجھ سے مال لے کر پیسے ادھار کر لیتا ہے۔ اس سوال پر کہ سنا ہے کہ فصلوں پر کام کرنے والے مزارعوں کا بہت استحصال ہوتا ہے، وہ بولا، ان مزارعوں سے کام لینا میری زندگی کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ سارا دن ان کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ کسی خوشی غمی پر کبھی جانا پڑ جائے تو پیچھے سے کھاد، اسپرے اور پانی بیچ دیتے ہیں۔ کئی ایک تو دیسی شراب کی بوتل کے پیچھے کچھ بھی بیچ دیتے ہیں۔ مجھے بتائیں میں کہاں دو نمبری کروں؟ ہمارے معاشرے میں کون سا شعبہ ہے جہاں ایمانداری سے بچوں کا پیٹ بھرا جاسکتا ہے؟ ایسا نہیں ہے کہ ایماندار لوگ نہیں ہیں، آٹے میں نمک کے برابر ہیں لیکن اکثر اوقات پریشان حال ہی دیکھے ہیں۔ ایسے میں کاشتکاری کا شعبہ ایک ایسا شعبہ بن چکا ہے جہاں جبری ایمانداری رائج ہے لیکن کاشتکار کے بچوں کے پیٹ خالی ہیں۔

زراعت اور کسان کے ساتھ تو جو کچھ ہو رہا ہے، سو ہو رہا ہے، سیاست کے شوگر ڈیڈی جو کچھ ملک کی جمہوریت کے ساتھ کر رہے ہیں وہ بھی اب کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اب کوئی حجاب، کوئی حیاباتی

نہیں رہی۔ انگریزی میں شوگر ڈیڈی اس امیر شخص کو کہتے ہیں جس کی عمر ڈھل چکی ہو لیکن اس کی ہوس پوری نہ ہوئی ہو۔ آپ دیکھ لیں کہ غیر جمہوری اور نام نہاد جمہوری قوتیں پاکستان میں ستر برس کی ہو چکی ہیں لیکن اقتدار سے جانے کا نام نہیں لیتی۔ پچھلے ستر سالوں میں کون سی ناکامی ہے جو انھوں نے اس ملک کے نام نہیں کی لیکن پھر بھی جمہوریت بری، پھر بھی عوام جاہل، پھر بھی پارلیمان پر لعنت۔ پچھلے انتخابات کے ذریعے پاکستان کی ستر سال کی تاریخ کا پہلا پرامن انتخابات ہوئے۔ انتخابات کو روکنے کے لیے اب کوششیں ناصر عروج پر پہنچ چکی ہیں بلکہ ہر وہ حربہ استعمال کیا جا رہا ہے جس کا آج کے انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے دور میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اب جبکہ حکومت اپنی مدت پوری کرنے کو ہے اور انتخابات میں صرف چند ماہ رہ گئے ہیں ایک دفعہ پھر ایسا ماحول بنایا جا رہا ہے کہ جس سے بروقت انتخابات کے امکانات معدوم ہو جائیں۔ ویسے تو پاکستان کی کوئی بھی حکومت صحیح معنوں میں عوام کی منتخب کردہ اور ترجمان نہیں ہوتی کیونکہ غیر جمہوری قوتیں انتخابات کے عمل کو بہت حد تک غیر شفاف بنا دیتی ہیں اور مختلف حربوں سے وسیع پیمانے پر قبل از انتخابات اور بعد از انتخابات دھاندلی کرتی ہیں لیکن بلوچستان کی حکومت خاص طور پر عوام کی بجائے کہیں اور سے بنائی جاتی ہے۔ بلوچستان کے عوام اس نظام کو مسٹر دکر چکے ہیں اس لیے انتخابات سے دور رہتے ہیں۔ حال ہی میں بلوچستان میں پانچ سو ووٹوں والے وزیر اعلیٰ کا جو کرشمہ ہوا ہے اور غیر جمہوری قوتوں کے مستقبل کے ارادوں پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ بلوچستان والا کرشمہ تو ہر کسی کو نظر آرہا ہے لیکن دراصل پاکستان میں مارشل لا عداوار کے علاوہ باقی کا آدھا وقت جو نام نہاد جمہوری ادوار رہے ہیں وہ بھی اسی طرح کی کرشمہ سازیوں کا ہی نتیجہ رہے۔ بد قسمتی سے کرشمہ سازی کا یہ کھیل پچھلے ستر سال سے جاری ہے لیکن

اس دفعہ ہر جمہوریت پسند کسی معجزے کی امید لگائے بیٹھا ہے۔ شاید ستر سالہ تاریخ میں پہلی دفعہ جمہوری قوتیں بازی جیتنے میں کامیاب ہو جائیں۔

غیر ملکی مداخلت

روزنامہ آواز، 19 اگست، 2016، ص 4 پ

پاکستان کے 70 ویں یوم آزادی کے موقع پر اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ 49 سال بیت جانے کے بعد پاکستان کو کن چیلنجز اور خطرات کا سامنا ہے، صورت حال بدل گئی، منظر نامہ بدل گیا ہے، جدید ہتھیاروں، حساس آلات، جاسوسی اور جاسوسوں کے نظام میں بے حد تبدیلی آئی ہے، سیٹلائٹ اور اسمارٹ فون، انٹرنیٹ سے حرکات و سکنات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کو اندرونی و بیرونی خطرات کا سامنا ہے۔ بیرونی خطرات میں پاکستان امریکی تعلقات، امریکہ کے جنوبی ایشیا میں عزائم، امریکہ کا افغانستان میں مستقل قیام، امریکہ اور بھارت گٹھ جوڑ، پاکستان میں مداخلت، آبی سوئچ بنالینا، کشمیر میں ریاستی دہشت گردی، بھارت کی بحری قوت میں خوفناک حد تک اضافہ، قیام پاکستان کے وقت سیکورٹی کے لیے مناسب ہتھیار موجود نہیں تھے، اپنے تحفظ کے لیے سیٹو اور سینٹو میں شامل ہوا، 1965ء کی جنگ میں پاکستان نے ان ہتھیاروں سے بہتر انداز میں اپنا دفاع کیا مگر 1971ء کی جنگ میں اس کو مشرقی بازو کی علیحدگی کی ہزیمت اٹھانا پڑی پھر سوویت یونین 1979ء میں افغانستان پر قابض ہو گیا تو امریکہ نے پاکستان کی مدد سے سوویت یونین کو شکست دی اور اب فروری 1989ء میں روس افغانستان سے نکل گیا تو پاکستان کی مدد سے ہاتھ اٹھالیا۔ مئی 1998ء میں ایٹمی دھماکے کے موقع پر امریکہ نے پھر سے ہم پر قدغن لگائی جس نے ہمیں موقع دیا کہ ہم اپنی ٹیکنالوجی خود پروان چڑھائیں، 9/11 کے واقعہ کے بعد امریکہ کو ایک دفعہ پھر ہماری ضرورت پڑی، خوف زدہ حکمرانوں نے ان کے مطالبات مان لیے، اس کے باوجود 2011ء میں امریکہ پاکستان پر تقریباً حملہ آور ہوا، جنوری 2011ء ریمینڈ ڈیوس واقعہ 2 مئی 2011ء ایبٹ آباد کا اور 26

ستمبر 2011ء سلالہ پر حملہ۔ اس برے وقت میں چینی اور روسی حکومتوں نے پاکستان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ روس کے آرمی چیف، چین کے ڈپٹی چیف پیپلز لبریشن آرمی نے 20 مئی 2011 کو پاکستان آکر تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ وہاں سے پاکستان کی پالیسی تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ اب پینٹاگون کہہ رہا ہے کہ دنیا کی چار ابھرتی ہوئی طاقتیں روس، چین، پاکستان اور شمالی کوریا اتحاد بنانے جارہے ہیں۔ یہ اتحاد بنتا بھی ہے یا نہیں ایسی رپورٹ قبل از وقت ہے۔ اس کے یہ معنی پہنائے جاسکتے ہیں کہ پاکستان کے خلاف نئی سازشوں کا آغاز ہو گیا ہے جس میں روس کی طرح (War Hybrid) چوکھی جنگ شروع کی جاسکتی ہے، جس میں تضادات کا ابھارنا، ملک میں خونریزی کرانا، فوج کو الجھانا وغیرہ شامل ہے جو پہلے ہی شروع کیے جا چکے ہیں۔ مگر آپریشن ضرب عضب اور کراچی آپریشن نے اس کو کافی قابو میں کیا ہے۔ امریکہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے ڈالرز کا بے دریغ استعمال کرتا ہے اور کسی بھی ملک میں مداخلت اپنا حق سمجھتا ہے۔ افغانستان کی طرف سے دہشت گردی اور عدم تعاون کیا جا رہا ہے۔ امریکہ اور بھارت نے چین کو گھیرنے کے لیے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ سیاسی اور ارضی، معاشی مفادات اس طرح سے معدنیات، پاکستان میں بے تحاشا سونے اور کونلے کی موجودگی، افغانستان میں معدنیات کا پایا جانا، بحیرہ عرب میں گرم پانی تک رسائی، پاکستان کی اپنے دفاع کی کوشش اور انڈیا کی بالادستی کی خواہش، افغانستان میں پراکسی جنگ اور کشمیر میں بھارت کا قبضہ اور پاکستان، چین اور انڈیا کے مفادات کا تصادم۔

امریکہ نے افغانستان میں اپنا قیام 2017ء تک بڑھا لیا ہے۔ اس کے وہاں پر مفادات اور وہ وہاں مستقل قیام کرے گا اس کے لیے افغانستان نے 9 زمین دوز اڈے قائم کر لیے ہیں ایسے اڈے قائم کرنے کے لیے ایک موزوں مقام تھا جہاں سے وہ پاکستان، ایران، چین، روس، سینٹرل ایشیا کے ممالک، بحر کیسپین جو معدنی دولت سے مالا مال ہے کے ارد گرد ممالک پر نظر رکھ سکتا ہے۔ واضح

رہے کہ چین پاکستان اقتصادی راہداری کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے۔ امریکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے درپے ہے۔ پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ طالبان کو پکڑ کر اس کے حوالے کرے جو ہماری استطاعت سے باہر ہے۔ دوسری طرف انڈیا خطے میں بالادست قوت بننے کی کوشش میں ایٹمی جنگ اور بحری، بری اور فضائی قوت کے علاوہ ایٹمی میزائل و سیٹلائٹ ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہا ہے۔ پر کسی وار کر رہا ہے، کراچی اور بلوچستان میں اس کی مداخلت کے ثبوت موجود ہیں۔ چین کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے امریکہ کے ساتھ ہے۔ غیر روایتی طریقوں میں وہ پاکستان کے خلاف پانی کو بطور ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ جب پاکستان کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ پانی روک دیتا ہے اور جب پاکستان میں پانی وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے تو وہ دریاؤں میں طغیانی پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح اس نے آبی دہشت گردی شروع کر رکھی ہے اور ایک طرح کا سوچ بچا دیا ہے جس سے وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے کھولتا بند کرتا ہے۔ اس سے ہماری فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے اور معیشت سماجی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ پھر بھارت نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے اور وہاں پر تحریک آزادی کو بری طرح سے کچل رہا ہے۔ تحریک آزادی میں اب تک ایک لاکھ سے زیادہ نہتے کشمیری شہید ہو چکے ہیں، انڈیا ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال کر رہا ہے اور کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق حل کرنے سے گریزاں ہے اور اس مسئلے کو چین کو گھیرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تاکہ چین پاکستان اقتصادی راہداری کو کشمیر اور افغانستان سے سینڈ وچ کر سکے۔ اگرچہ پورے خطے کے لیے یہ ایک خطرناک عمل ہے، یہ انڈیا کو تقسیم کر دے گا اور پورے خطے کو متاثر کرے گا بلکہ عالمی جنگ کا فلیش پوائنٹ بھی ہے۔ اندرونی خطرات میں عسکریت پسندی، مسلح گروہوں، سیاسی پارٹیوں میں مسلح ونگ، دہشت گردی و جرائم، خراب

حکمرانی، بے تحاشا کرپشن، غیر ملکی مداخلت، پراکسی وار، پانی کا مسئلہ و سیلاب، موسمی تغیرات، خوراک کا مسئلہ شامل ہے۔

پاکستان میں امن و امان کو اس قدر بگاڑ دیا ہے کہ اس عفریت کو قابو پانے کے لیے فوج کی طاقت کو استعمال کرنا پڑا۔ اس عفریت کو کئی عشروں تک بے قابو رکھا جس کی وجہ سے پاکستان کے 60 ہزار شہری در 6 ہزار فوجی شہید ہوئے۔ مگر اب اس کو ضرب عضب اور کراچی آپریشن کے ذریعے قابو میں رکھا گیا ہے۔ مگر جہاں موقع ملتا ہے دہشت گرد حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ جیسے کوئٹہ میں آٹھ اگست اور گیارہ اگست 2016ء کے خودکش حملے، حکمرانی کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، حکومت کو عوام کا صحیح نمائندہ بن کر اس کے مسائل حل کرنا چاہئے۔ غیر ملکی مداخلت اور پراکسی وار کو روکنے کے لیے قومی یک جہتی ضروری ہے۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرپشن ہو رہی ہے جس سے نمٹنے کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے۔ پانی کی کمی اور سیلاب کے لیے ہمیں تدابیر اختیار کرنا ہوں گی۔ جھیلیں، تالاب اور ہائیڈرل ڈیم بنانا ہوں گے۔ موسمی تغیرات سے نمٹنے کے لیے گھروں کی تعمیر میں خیال رکھنا ہو گا۔ دس فٹ کی چھت کی بجائے پندرہ فٹ کی چھت اور درختوں کو زیادہ تعداد میں افزائش کرنا ہو گی۔

خوراک کے مسئلے پر سخت توجہ کی ضرورت ہے، جرائم بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ان کا سد باب اچھی حکمرانی اور پولیس کی اچھی کارکردگی سے کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کی سرحدوں کی تبدیلی کی سازش کو ناکام کر دینا چاہئے۔ بھارت کے کئی سطحی ریشہ دوانیوں کو بے اثر کرنا چاہئے۔ پاکستان میں مداخلت، افغانستان سے گلہ جوڑ توڑ دینا چاہئے۔ بحری، فضائی اور بری قوت میں اضافہ لازمی ہے اور انڈیا کی نیوکلیر سپلائرز گروپ میں شمولیت کو روکے رکھنا پڑے گا۔ آبی وسائل سے فیض یاب

ہونے کے لیے پاک بحریہ کو مضبوط بنانا ضروری ہے۔ لیزر اور سائبر ٹیکنالوجیز کا حصول ممکن بنایا جائے اور اس پر واضح پالیسی کا اعلان کیا جائے۔ کئی سیٹلائٹ کو لانچ کرنا چاہئے۔ آبی و سمندری معدنیات اور حیاتیات سے استفادہ کرنے کا ماحول پیدا کیا جائے۔

مردم شماری میں بلا جواز تاخیر

روزنامہ آواز، 19 مارچ 2014ء بس 4

مردم شماری پاکستان میں ایک انتہائی چیلنجنگ اور متنازع امر رہا ہے۔ آخری مرتبہ مردم شماری 1998ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے کئی مواقع پر ملک میں چھٹی مرتبہ مردم شماری کی کوششیں ہوئیں لیکن یہ تیاریاں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ جب ایک قوم درست طور پر اپنے نفوس کی تعداد گننے سے قاصر ہوتی ہے تو سیاسی، معاشی، عمرانی اور ترقیاتی اعتبار سے اس کے اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ تین طرح کے سوالات سے قومی اہمیت کے حامل اس انتہائی اہم معاملے پر روشنی ڈالنے میں مدد ملے گی۔ مردم شماری کا انعقاد اتنا مشکل کیوں ہو رہا ہے؟ اور اس کے عدم انعقاد کی کیا سیاسی قیمت چکانی پڑی ہے؟ اور ترقیاتی منصوبوں کی منصوبہ بندی اور وسائل مختص کرنے کے حوالے سے اس کا کیا کردار ہے؟ اول مردم شماری کے انعقاد کی راہ میں چیلنج اور اس بابت ہونے والی سیاست ہے۔ مردم شماری کے انعقاد کی توقع ہر دس برس میں ایک مرتبہ تھی جو کہ 1951ء، 1961ء، 1972ء اور 1982ء میں ہوئی۔ واضح رہے کہ 1971ء کی جنگ کی وجہ سے اس سال ہونے والی مردم شماری میں ایک برس کی تاخیر ہوئی، پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد چار دہائیوں تک باقاعدگی سے مردم شماری ہوئی۔

1991ء میں ہونے والی مردم شماری خانہ شماری کے لئے اعداد و شمار جمع کیے جانے کے باعث التوا کا شکار ہوئی۔ اعداد و شمار کی درستی پر صوبوں کا عدم اتفاق اس معاملے کی متنازع سیاسی نوعیت کی عکاسی ہے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کی بنیاد پر صوبوں میں قومی وسائل کی تقسیم کے ذریعے ان کا حصہ ملے کیا جاتا ہے اور متنازع اعداد و شمار لازمی طور پر اختلاف کی جانب لے جاتے ہیں۔ 17 برس تک

یہ اختلاف مردم شماری کی راہ میں حائل رہا، بالآخر مارچ 1998ء میں ن لیگ کی حکومت نے پانچویں مرتبہ مردم شماری کرائی۔ اس وقت کے وزیر خزانہ سرتاج عزیز نے اس کام کے لیے سخت محنت کی۔ 1998ء کی مردم شماری کی رپورٹوں کے مطابق اس عمل میں فوج کے شامل ہونے کی وجہ سے صوبوں کے خدشات کو تقویت ملی۔ فوجی اہلکاروں کے مردم شماری میں شامل ہونے کی وجہ تحفظ یقینی بنانا نہیں بلکہ شمار کنندگان کی معاونت اور اس عمل میں صداقت کو یقینی بنانا تھا۔ 16 سال گزر جانے کے بعد اب تک کوئی مردم شماری نہیں ہوئی۔ 2006ء میں اس سلسلے میں کوشش کی گئی تاہم فوج کی عدم دستیابی کے باعث یہ عمل نہ ہو سکا۔ 2010ء میں سیلاب اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ 2011ء میں بھی اس کام کو کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن کچھ ایسی پیش رفتیں ہوئیں جنہوں نے 1900ء کی دہائی کی یادیں تازہ کر دیں۔ مارچ 2011ء میں آئندہ ہونے والی مردم شماری کے لیے پیشگی اقدام کے طور پر خانہ شماری کے عمل کا آغاز کیا گیا۔ 18 ویں آئینی ترمیم کے تحت مردم شماری کے فیصلے کی منظوری مشترکہ مفادات کونسل (سی سی آئی) سے لی جاتی ہے۔ جب خانہ شماری کے نتائج سی سی آئی کے سامنے پیش کیے گئے تو بنیادی طور پر سندھ اور بلوچستان کے اعداد و شمار پر تنازع اعداد و شمار نے جنم لیا جو کہ گنتی کی صداقت کے حوالے سے تھا، جس پر سی سی آئی نے مردم شماری کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ بعد ازاں پریس میں یہ بات افشا ہوئی کہ ان اعداد و شمار میں کچھ غلطیاں اختلافات کا باعث بنیں، خانہ شماری کے مطابق آبادی کا تخمینہ 19 کروڑ 20 لاکھ تھا جبکہ غیر جانبدار تنظیموں کی جانب سے اس حوالے سے پیش کیا جانے والا تخمینہ 17 کروڑ 50 لاکھ تھا۔

بنیادی طور پر سندھ اور بلوچستان کے اعداد و شمار میں تضادات پائے گئے تھے۔ خانہ شماری کے مطابق سندھ کی آبادی کا تخمینہ پانچ کروڑ پچاس لاکھ تھا جبکہ اس کے مطابق نقل مکانی جیسے تغیر پذیری کے حامل محرک کے تحت سالانہ اضافے کو مد نظر رکھ کر آبادی کا تخمینہ تقریباً 4 کروڑ 20

لاکھ لگایا گیا۔ اس تخمینے میں 1.34 کروڑ نفوس کے فرق نے ان اعداد و شمار کو ناقابل یقین بنادیا۔ بلوچستان کے اعداد و شمار میں بھی اسی قسم کے تضادات کا انکشاف ہوا جو کچھ ہو رہا تھا وہ واضح تھا، جس میں کراچی و کوئٹہ کے مخالف نسلی گروہ وسائل کے زائد حصول کی مسابقت میں دست و گریب اب اس تھے، وسائل کے حصے کو بڑھوانے میں ایک بہتر طور پر منتظم گروہ نے اپنی برادری کو اپنے اہل خانہ کی تعداد زیادہ ظاہر کرنے کے حوالے سے حوصلہ افزائی کی۔ جس کے نتیجے میں صوبائی سطح پر آبادی کے اعداد و شمار میں اضافہ ہوا، زمینی حقائق کے برعکس بڑھتی ہوئی آبادی کے تخمینے نے ان اعداد و شمار کو مشتبہ بنادیا۔ 2011ء میں ہونے والی خانہ شماری میں لسانی گروہوں کے مابین طاقت اور وسائل کی مسابقت بن گئی اور اتنی شدت اختیار کر گئی کہ کراچی میں دوسرے کاری شمار کنندگان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جبکہ 2 زخمی ہوئے۔ جس کے بعد مردم شماری کے عملے کی سیکورٹی ایک مسئلے کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ قومی سطح پر پولیو کی مہم پر تشدد کاروائیوں کی نذر ہو کر بار بار ملتوی ہوئی۔ مردم شماری کے انعقاد کی راہ میں حائل مشکلات دو چند ہو گئیں۔ دریں اثنا مردم شماری کے عدم انعقاد کے نقصانات عیاں ہیں جن میں پہلا سیاسی ہے، نئی مردم شماری کے عدم انعقاد کی صورت میں قومی اور صوبائی حلقوں کی حلقہ بندیاں 1998ء کی مردم شماری کی بنیاد پر ترتیب دی گئی ہیں جس سے نئے ضلعوں اور تحصیلوں کو شامل کرنے کے لیے حلقوں کی حدود میں معمولی رد و بدل کیا گیا ہے۔ اس لیے انتخابی حلقہ بندیاں آج کے زمینی حقائق کی عکاسی نہیں کرتیں۔ دیہی علاقوں کو زیادہ جبکہ شہری علاقوں کو کم نمائندگی حاصل ہے کیونکہ گزشتہ دو دہائیوں میں ملک میں شہری آبادی میں زیادہ اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ دیہی علاقوں سے عوام کی شہروں کی جانب ہجرت ہے۔

ہمارے ملک کی شہری آبادی جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ شماریات کے اعلیٰ افسر نے بتایا کہ محض شہری آبادی کی تعریف میں رد و بدل پاکستان کو شہری آبادی کی اکثریت والا ملک دکھائے گا۔ 2002ء میں پارلیمانی نشستوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا تھا لیکن انتخابی حلقہ بندیاں 1998ء کی مردم شماری کی بنیاد پر مرتب کردہ ہیں۔ مگر وہ آبادیاتی اعداد و شمار سیاسی جمود کے تسلسل کا موجب ہیں اور ساتھ ہی مختلف سیاسی جماعتوں کو نقصان پہنچا کر کچھ سیاسی جماعتوں کو فائدہ ملنے کی وجہ بھی بنتا ہے۔ یہ امر جمہوریت کی بنیادی نمائندگی کو زک پہنچاتا ہے۔ انتخابی حلقوں کی حلقہ بندیوں میں آج کی صورت حال کی عکاسی ہونی چاہئے، نہ کہ ماضی کی۔ اس وجہ سے الیکشن کمیشن حکومت پاکستان پر مردم شماری کا حکم دینے کے لیے زور دینے میں سب سے آگے رہا ہے، جیسا کہ حال ہی میں پریس میں ایک رپورٹ سامنے آئی کہ الیکشن کمیشن کی جانب سے وزیر اعظم کو ایک سمری ارسال کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آئین کے تحت نئی حلقہ بندیوں کے لیے نئی مردم شماری ضروری ہے جو کہ آئندہ عام انتخابات سے قبل ہونی چاہئے۔ یہی درخواست سابق چیف الیکشن کمشنر نے مئی 2013ء کے انتخابات سے قبل کی تھی جس پر کان نہیں دھرے گئے۔ الیکشن کمیشن کی جانب سے دیا جانے والا یہ پیغام اور اس کے ساتھ 2011ء میں بین الصوبائی رابطہ ڈویژن سے مردم شماری کے لیے زور دیا گیا۔ مردم شماری کو سی سی آئی کے ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا جس کا اجلاس 1 فروری کو ہونا تھا لیکن بد قسمتی سے اس اہم مسئلے کو نہیں اٹھایا گیا۔ شاید اس کی وجہ صوبوں کے مابین اختلافات کے طول پکڑ لینے کا خدشہ ہو لیکن پھر بھی مردم شماری کا مسئلہ سی سی آئی کے ایجنڈے میں شامل رہا۔ پرانے آبادیاتی اعداد و شمار کے استعمال کے نقصانات سیاسی نتائج سے کم اہم نہیں ہیں۔ عوام کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی کا دار و مدار آبادی کے درست اعداد و شمار پر ہوتا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں میں اس وقت رد و بدل کیا جاتا ہے جبکہ اعداد و شمار تازہ نہ ہوں یا

تخمینوں کی بنیاد پر ہوں جو کہ موجودہ صورت حال میں ہے۔ تعلیم اور صحت عامہ کی خدمات اس وقت تک درست طور پر عوامی ضروریات کی عکاسی نہیں کرتیں اگر منصوبہ بندی تخمینوں کی بنیاد پر ہو، جن میں مثال کے طور پر نقل مکانی کے اعداد و شمار، آبادی کی منتقلی کی معلومات، عمر اعداد اور جنس کے اعداد و شمار نہیں ہوتے۔

مردم شماری عوام کی گنتی سے زیادہ ایک اہم کام کرتی ہے، یہ اہم سماجی اور معاشی عوامل کی نشاندہی کرتی ہے جس میں آبادی میں اضافے کی شرح اور اس کا پھیلاؤ، دیہی اور شہری آبادی کی تقسیم، عمر کا ڈھانچہ، شرح خواندگی، تعلیم کا حصول، ملازمت، ہجرت اور صحت عامہ کی سہولتوں کی نشاندہی شامل ہے۔

باب چہارم غذائی تحفظ

غذائی عدم تحفظ

اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے ورلڈ پروگرام نے اپنی حالیہ رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور غربت کے باعث گندم اور آٹے کا استعمال کم ہو گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کے لیے پاکستان میں کنٹری ڈائریکٹر وولف گینگ ہر مینگر نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ پاکستان کے لوگوں کے پاس آٹا خریدنے کی قوت کم ہو گئی ہے۔ وولف گینگ کا یہ بھی کہنا ہے کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے جبکہ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ آٹے کے کم استعمال کا مطلب یہ ہے کہ لوگ کم کھا رہے ہیں۔ ایک اور تشویش ناک رپورٹ بھی سامنے آئی ہے۔ ایرپورٹ سوس ایجنسی فار ڈویلپمنٹ اینڈ کوآپریشن نے تیار کی ہے، جو پاکستان میں فوڈ سیکورٹی کی صورت حال کے حوالے سے ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے 48.6 فیصد لوگ غذائی تحفظ کا شکار ہیں یعنی ہمارے وطن عزیز کی نصف آبادی کو یہ تحفظ حاصل نہیں ہے کہ اسے جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے خوراک میسر ہوگی۔ خوراک کے حوالے سے عدم تحفظ میں اضافہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس جنگ کے پاکستان کی معیشت اور ترقی پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت کے پاس وسائل محدود ہیں۔ یہ وسائل دفاعی اخراجات، قرضوں کی ادائیگی، ایڈمنسٹریشن اور پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پر خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق دفاع اور قرضوں کی ادائیگی کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن ملٹری اور غذائی تحفظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خوراک کا عدم تحفظ محض انسانی مسئلہ نہیں بلکہ رپورٹ کے مطابق نیشنل سیکورٹی ایشو یعنی قومی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ مبصرین کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں رپورٹس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بڑھتی ہوئی غربت اور مہنگائی کی وجہ سے بحیثیت قوم ہم روکھی روٹی کھانے کے قابل بھی نہیں رہے جبکہ ہم باتیں ایسی کرتے ہیں کہ کسی سپر پاور ملک کے

شہری بھی ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہم نے امریکہ کے جال میں پھنس کر دنیا کی خطرناک ترین جنگ کے شعلے اپنی سر زمین پر بھڑکا دیے ہیں، جو ہمارے ارمانوں اور امیدوں کو بھسم کر رہے ہیں۔ ایک طرف انتہا پسند گروپ ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ وہ امریکہ کو صفحہ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے اور دوسری ان انتہا پسند گروپس کے خلاف ہماری حکومت اور افواج جنگ لڑ رہی ہیں۔ اس جنگ میں ہم نے اپنے سارے وسائل جھونک دیے ہیں۔ مقروض ملک کے خسارے والے بجٹ میں گزشتہ کئی سالوں سے اربوں روپے اس جنگ کے لیے مختص کیے جاتے ہیں۔ فوجی افسر اور جوان اپنی زندگیاں قربان کر رہے ہیں۔ ان گنت شہری دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں اور بحیثیت قوم ہم اس امید میں ہیں کہ اس جنگ کے بعد ہم دنیا کی عظیم طاقت بن کر ابھریں گے، ہر طرف دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی، خوشحالی کا دور دورہ ہوگا اور لوگ اس قدر آسودہ ہوں گے کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر کریں گے۔ انتہا پسند گروہ بھی یہی تاثر دیتے ہیں کہ امریکہ کی تباہی کے بعد دنیا جنت بن جائے گی۔ پتہ نہیں وہ وقت کبھی آئے گا بھی یا نہیں لیکن اس وقت حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی نصف آبادی غذائی تحفظ کا شکار ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت سوئس رپورٹ کے مطابق دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے، جس کے پاکستانی معیشت پر بہت منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اور یہ اثرات اس قدر بھیانک ہیں کہ اقوام متحدہ کے مطابق آٹا موجود ہے لیکن پاکستان کے لوگ آٹا خرید نہیں سکتے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے ساتھ ساتھ غربت اور مہنگائی میں اضافے کا ایک اور سبب بھی ہے، عالمی مالیاتی فنڈ کے مطابق وہ سیاسی غیر یقینی ہے۔ جس کے نتیجے میں مہنگائی بڑھی ہے اور اس سے غربت میں اضافہ ہوا ہے۔

جب ملک کی اکثریتی آبادی کے پاس روکھی روٹی حاصل کرنے کی سکت بھی نہ ہو تو کیا لگتا ہے کہ اس ملک میں بڑے بڑے طرم خان سامنے آجائیں اور ان میں سے ہر کوئی یہ کہے کہ وہ ملک کو چلانے کی

واحد امید ہے۔ سیاستدان اور جمہوری ادارے ناکام ہو گئے ہیں۔ غربت اور مہنگائی کے علاوہ یہ طرم خان لوگ بھی اس ملک کا ایک اور بڑا مسئلہ ہیں۔ انھیں شاید اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ ملک میں شروع سے اگر جمہوریت کو چلنے دیا جاتا تو پاکستان امریکہ کے چنگل میں اس طرح نہیں پھنستا کہ اب نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

پاکستان کو اب اس وقت انصاف دلانے کی باتیں کی جا رہی ہیں جب انھیں انصاف سے زیادہ روٹی کی ضرورت ہے۔ یہ جسٹس منیر کا انصاف تھا جس کی سزا آج تک پاکستان کو مل رہی ہے۔ انھوں نے پاکستان کو غیر جمہوری قوتوں کے خونی شکنجوں میں دے دیا اور ان قوتوں نے احتساب سے بالاتر ہو کر پاکستان کو لوٹا اور اس کی خود مختاری امریکہ کے حوالے کر دی۔ امریکہ نے ناصر ف پاکستان میں جمہوریت مخالف نظام مستقل بنیادوں پر وضع کیا بلکہ پاکستان کی سر زمین کو خون میں نہلا دیا۔ لوگ ناصر روٹی کے لیے ترس رہے ہیں بلکہ خون ریز اور المناک عہد پر صدیوں ماتم کرتے رہیں گے۔ آج جو امریکہ کے خلاف جہاد کی بات کر رہے ہیں، وہ بھی امریکہ کا کام کر رہے ہیں۔ جو کرپشن کے خلاف جہاد کی بات کر رہے ہیں، وہ بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر امریکہ کا کام کر رہے ہیں۔ آج اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کو امریکی شکنجے سے نکالا جائے۔ امریکہ نے پاکستان کو اس منزل تک پہنچایا ہے۔ پاکستان کو امریکہ سے نجات دلانے کا عمل وہاں سے شروع ہو گا جہاں سے مولوی تمیز الدین کی آئینی درخواست مسترد ہونے سے رک گیا تھا اور پاکستان آسمانوں کے ہاتھوں امریکہ کی نو آبادی بنتا گیا، یہاں تک کہ جمہوری اور سیاسی قوتیں بھی ان جنگجوں سے آزاد ہونا چاہیں تو نہیں ہو سکتیں۔ اب ایک ایسی جنگ میں ہم پھنس چکے ہیں جس کا ہر فریق اپنی مرضی سے اس جنگ میں شامل ہوا اور نہ اس سے اپنی خواہش کے مطابق نکل سکتا ہے اور آج اس جنگ کی وجہ سے آٹا موجود ہونے کے باوجود ہم خرید نہیں سکتے۔ اس نہج پر پاکستان کو

پہنچانے والے امریکہ کے شکنجوں سے پاکستان کو نکالنا ہے تو مولوی تمیز الدین کیس میں جسٹس منیر کے فیصلے کے اثرات سے پاکستان کو نکالنا ہو گا اور یہ امر یقینی بنانا ہو گا کہ ایسا فیصلہ پھر کبھی نہ ہو کہ لوگ انصاف کی بجائے روٹی مانگیں۔

اقوام متحدہ کا اعلان خوراک

گزشتہ دنوں اٹلی کے دارالحکومت روم میں اقوام متحدہ کی عالمی خوراک کانفرنس نے اعلان خوراک کرتے ہوئے بتایا ہے کہ 2020 تک دنیا بھر میں بھوکوں کی تعداد میں پچاس فیصد تک کمی کر دی جائے گی۔ دنیا کے ایک ارب افراد کو بھوک سے بچانے کے لیے موثر پروگرام ترتیب دیا جائے گا۔ خوراک کی پیداوار میں اضافے کے لیے خصوصی مہم چلائی جائے گی اور دنیا بھر میں کسانوں کو اناج کی کاشت کے لیے ترغیبات دی جائیں گی۔ اس موقع پر ممبر ملکوں اور عالمی اداروں کی جانب سے عالمی خوراک پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے ساڑھے چھ ارب ڈالر کے فنڈز کی فراہمی کے وعدے کیے گئے۔ اسلامی ترقیاتی بینک نے اپنے بیت المال سے ڈیڑھ ارب، ورلڈ بینک نے اپنے خزانے سے ایک ارب میں کروڑ اور افریقی ترقیاتی بینک نے ایک ارب ڈالر فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ امریکی وزیر خوراک اور ای یو کے سیکرٹری نے اس موقع پر کہا ہے کہ امریکہ دنیا سے بھوک کے خاتمے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کو تیار ہے۔ دنیا کی 1.6 بلین (ارب) آبادی کا 12 فیصد حصہ قحط سالی کا شکار ہے۔ خام تیل کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے مختلف ممالک کی حکومتوں کو متبادل ایندھن کی جانب توجہ مبذول کرنی پڑ رہی ہے جس کے نتیجے میں بائیو فیول پودوں کی پیداوار میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور غذائی اجناس کے لیے زمین کی قلت پیدا ہو گئی ہے۔ بائیو فیول پودوں کی پیداوار کے نتیجے میں غذائی اجناس مثلاً گندھوں، سویا بین، چاول، مکئی اور پام آئل کی پیداوار میں کمی ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر دنیا آج معاشی قحط سالی کے بحران کا شکار ہے۔ مہنگائی میں بے تحاشہ اضافہ ضروریات زندگی کی بنیادی اشیاء کی قلت، قدرتی وسائل کا غیر ضروری استعمال، اشیاء کی قیمت کے تعین پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری فصولوں کی پیداوار میں گراؤ جیسے امراض نے پوری معیشت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے جس کے سبب پوری انسانیت پر

یشانیوں میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے اور عالمی خوراک و معاشی بحران کے خاتمہ کے لیے سوشلسٹ نظام وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکا ہے۔ آج دنیا ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام پر مشتمل صدیوں پرانا نظام معیشت زمین دوز ہو رہا ہے اور ایک ایسے نظام معیشت کا طلب گار ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی لغت سے نکال کر تمام لوگوں کو معاشی ترقی کے یکساں مواقع فراہم کر سکے۔ آج دنیا میں 33 ممالک ایسے ہیں جہاں لوگوں کو غذا نہ ملنے کی وجہ سے فسادات ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک ملک کشور حسین شاد باد بھی ہے۔ ورلڈ فوڈ پروگرام کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کم و بیش نصف پاکستانی مہنگائی میں اضافہ کے باعث خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ گزشتہ ماہ بھوک و افلاس کا شکار افراد کی تعداد میں 35 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ گزشتہ سال یہ تعداد 6 کروڑ کے لگ بھگ تھی جو آج بڑھ کر 7 کروڑ 70 لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ غریب آدمی کی قوت خرید قریباً 50 فیصد تک کم ہو گئی ہے۔ عالمی خوراک پروگرام کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں 30 ملین ٹن آٹا (سالانہ) استعمال ہوتا ہے جو اب نایاب یا کمیاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاک سرزمین کے 35 اضلاع کے باشندے غذائی قحط سالی کا شکار ہیں۔ یہ گھمبیر صورت حال صرف پاکستان ہی میں نہیں پائی جاتی۔ آسٹریلیا جو گیہوں برآمد کرنے والے ملکوں میں سرفہرست تھا اسے بھی 60 سالہ تاریخ کے شدید ترین بحران کا سامنا ہے۔ وہاں 2012ء میں 22.5 ملین ٹن گیہوں پیدا ہوئی۔ امریکہ کو بھی اس قسم کے حالات کا سامنا ہے۔ ترکی میں تو گزشتہ سال 15.5 ملین ٹن گیہوں کے مقابلے میں صرف پانچ لاکھ ٹن پیداوار ہوئی۔ یہاں تک کہ کینیڈا اور فرانس، برازیل، چین، بھارت، جرمنی اور ارجنٹینا سمیت گندم اور گیہوں اگانے والے تمام ممالک اس خشک سالی و قحط سالی کا شکار ہوئے۔ یہاں ملک عزیز کا مقابلہ بھارت سے کیا جا رہا ہے۔ تقسیم کے بعد زر خیز پنجاب ہمارے حصے میں آیا اور بھارت کو بنجر، ناہموار اور غیر زر خیز پنجاب ملا لیکن ہوا یہ کہ بھارتی

پنجاب میں 33 لاکھ ایک ہزار ایکڑ رقبہ پر گیہوں کاشت کی جاتی ہے جبکہ مملکت خداداد کے کسان 59 لاکھ 34 ہزار ایکڑ کے رقبہ پر بوائی کرتے ہیں لیکن ہم سے کم رقبہ پر کاشت کاری کے باوجود دشمن ملک میں زیادہ اناج اگتا ہے۔ بھارتی کسان ایک ایکڑ سے قریب پانچ ہزار کلو گرام گیہوں حاصل کرتا ہے جبکہ پاکستانی کاشت کار قسمت کا دھنی ہو تو پھر بھی پیداوار 2400 کلو گرام سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ ہمارے پنجاب کے دو لاکھ پانچ ہزار 349 مربع کلومیٹر رقبہ میں سے 1 کروڑ 11 لاکھ 40 ہزار ایکڑ اراضی قابل کاشت ہے جب کہ ہمارے دشمن نمبر کے پچاس ہزار 362 کلومیٹر رقبہ میں سے صرف 42 لاکھ 66 ہزار ایکڑ زمین پر فصل اگائی جاسکتی ہے۔ یہاں میں آسٹریلیا، برازیل، امریکہ، کینیڈا کی بات نہیں کر رہا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ بھارت کم زرعی رقبہ رکھنے کے باوجود ہم سے زیادہ پیداوار کرنے کا اہل ہے۔ ہم سے زیادہ فصل حاصل کرتا ہے؟ آخر کچھ توجہ ہوگی ان دونوں پنجاب کی آب و ہوا، رہن سہن، رسم و رواج اور محنت و مشقت ایک ہے تو نتائج کیوں ایک سے نہیں آتے؟ کیا ان دونوں پنجاب کی زمینیں زرخیزی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟ پھر بھارتی پنجاب ہم سے آگے کیوں ہے؟

غذائی اجناس کا ضیاع

آئے روز سنتے ہیں کہ غربت و افلاس کے خاتمے کے لیے دنیا بھر کی حکومتیں اور مخیر حضرات مل کر کاوشیں کر رہے ہیں مگر بھوک ننگ ہے کہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ گاہے بگاہے خیال آتا ہے کیا آسمان سے رحمت ایزدی برسنے کا سلسلہ موقوف ہو گیا ہے یا ہماری زمینیں بخر ہو گئی ہیں؟ شماریات کے ادارے بتاتے ہیں کہ پاکستان سمیت پوری دنیا کے وسائل آبادی میں اضافے کے مقابلے میں تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہیں۔ بالخصوص غذائی اجناس کی پیداوار تو ہماری ضرورت کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے مگر پھر بھی ایک منٹ میں 18 افراد بھوک سے مر جاتے ہیں۔ اس بے برکتی کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے نکلے تو ایسے چشم کشا انکشاف ہوئے اور یوں لگا جیسے فاقوں مرتے ان انسانوں کے خون کے کچھ چھینٹے تو ہمارے دامن پر بھی ہوں گے۔ آپ بھی غور کیجئے کہ اس قتل ناحق میں آپ کا کتنا ہاتھ ہے۔ دنیا بھر کی غذائی اجناس کی پیداوار کا تخمینہ چار ارب ٹن سالانہ ہے۔ 2012ء میں سویڈش انسٹیٹیوٹ فار فوڈ اینڈ بائیو ٹیکنالوجی نے ایک رپورٹ جاری کی جس کے مطابق ہر سال 1.3 ارب ٹن کھانے پینے کی اشیاء، زائد المعیاد ہونے کے بعد کوڑا دان میں پھینک دی جاتی ہیں۔ 2013ء کے آغاز میں ایک برطانوی ادارے نے تصحیح کی کہ ضائع ہونے والی غذائی اجناس کا تخمینہ دو ارب ٹن ہے یعنی جو کچھ ہم اگاتے اور بناتے ہیں اس کا نصف کھائے پیئے بغیر گندگی کے ڈھیر میں بدل جاتا ہے۔ صرف برطانیہ میں ہر سال 15 ملین ٹن کی غذائی اجناس تلف کی جاتی ہیں جن کی مالیت 15.1 ملین پاؤنڈ ہے۔ ہر فیملی اس ضیاع میں شراکت دار ہے اور اوسطاً 700 پاؤنڈ ز فضول خرچی کی نذر کرتی ہے۔ یونیورسٹی آف ایری زونا کے لیمبر پالوجسٹ Timothy Joney جنھوں نے اس موضوع پر تحقیق میں ساری زندگی لگا دی، ان کا خیال ہے کہ جو ملک جتنا ترقی یافتہ ہے، انسانی وسائل کے ضیاع کا اتنا ہی بڑا ذمہ دار ہے۔ سب سے زیادہ خوراک امریکہ میں

ضائع ہوتی ہے۔ امیر کی حکومت ہر سال ایک بلین ڈالر کی خطیر رقم ضائع شدہ خوراک کو ڈمپ کرنے پر خرچ کرتی ہے۔ ہر یورپی باشندہ سالانہ 95 سے 115 کلو غذائی اجناس استعمال کیے بغیر پھینک کر غریبوں کے منہ سے نوالہ چھیننے کا جرم کرتا ہے۔ پورے براعظم افریقہ کی مجموعی غذائی پیداوار 230 بلین ٹن ہے جبکہ یورپی ممالک ہر سال 232 بلین ٹن کی اشیاء کو ڈے دان میں ڈال دیتے ہیں۔ اگرچہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں صورت حال قدرے بہتر ہے تاہم پاکستان سمیت جنوبی ایشیاء کے مختلف ممالک میں غذائی اجناس کے ضیاع کی فی کس شرح سے کلوہے اور اس میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ کھانے پینے کی ان اشیاء کی خریداری پر صرف کیے گئے 950 بلین ڈالر تو ہر سال مٹی میں مل ہی جاتے ہیں مگر ہم اور بھی ناقابل تلافی نقصان اٹھاتے ہیں مثلاً جو کھانا کبھی کھایا نہیں جاتا، جو پھل کسی کے استعمال میں نہیں آتے، جو سبزی فریجوں میں پڑی گل سڑ جاتی ہے اسے اگانے پر 500 بلین کیوبک میٹر پانی استعمال ہوتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کی دن رات محنت اکارت چلی جاتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ خوراک کے ضیاع کے اسباب کیا ہیں؟ آخر کیوں محنت سے کمائی یا بغیر محنت سے ہاتھ آئی دولت کو یوں برباد کر دیا جاتا ہے؟ غربت و تنگدستی کی یہ ذلت ہمارا مقدر کیوں ہو چلی ہے؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جب اسراف آتا ہے تو قلت و ذلت بھی چلی آتی ہے اور خیر و برکت چپکے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس متمدن معاشرے نے ترقی کے نام پر ایسے لائف اسٹائل کو جنم دیا ہے کہ محض امیر ہی نہیں، لوئر میڈل کلاس کے لوگ بھی فضول خرچی کے رسیا ہو گئے ہیں۔ چند دہائیاں پہلے تک ضرورت کی اشیاء گلی محلے کی دکانوں سے خریدی جاتیں، کچھ بچ جاتا یا ضرورت سے زائد ہوتا تو فوراً ہمسایوں میں تقسیم ہو جاتا۔ زمانے کے انداز بدلے تو پورے مہینے کا راشن ایک ساتھ خریدا جانے لگا۔ اہل زر کی طلب بڑھی تو انھوں نے صارفین کی جیبوں پر ڈاکہ

ڈالنے کی ایک ترکیب سوچی۔ شہروں میں بڑے بڑے سپر اسٹور کھلنے لگے۔ دلیل یہ تھی کہ اگر بازار آپ کے پاس خود چل کر آجائے اور بیسیوں دکانیں گھومنے کی بجائے ایک ہی اسٹور سے سب اشیاء دستیاب ہو جائیں تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ سینے اس میں کیا قباحت ہے۔ برطانیہ میں ٹیسکو کے نام سے ایک مشہور سپر مارکیٹ ہے۔ چند روز قبل کیے گئے ایک سروے کے دوران معلوم ہوا کہ یا اس سے خرید اگیا دو تہائی مال کسی کے استعمال میں نہیں آتا۔ 68 فیصد سلا، 488 فیصد بیکری آئٹمز اور 24 فیصد انگور ٹرالیوں میں بھر کے لے جانے کے بعد کچھ دن گھروں میں فریج کی زینت بنتے ہیں اور پھر پھینک دیے جاتے ہیں۔ پانچ میں سے دو سیب اور ہر پانچواں کیلا کسی انسان تو کیا حیوان کی خوراک بھی نہیں بنتا اور کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ گزشتہ برس ایک آن لائن شاپنگ سنٹر نے سروے کرایا تو معلوم ہوا کہ برطانوی خواتین ہر سال دو بلین پاؤنڈز غیر ضروری شاپنگ پر خرچ کر دیتی ہیں۔ ہر برطانوی خاتون سال بھر میں 104 پاؤنڈ ایسے ملبوسات پر ضائع کر دیتی ہیں جس کی اسے ضرورت تو نہیں ہوتی مگر کسی شاپنگ مال سے گزرتے ہوئے اچھا لگنے پر خرید لیے جاتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ غیر ضروری شاپنگ میں مارکیٹنگ کے حربوں کا بنیادی عمل دخل ہے۔ مثلاً خصوصی تشہیر کے ذریعے وہ اشیاء خریدنے پر مائل کیا جاتا ہے جن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کو ایک پیکھے کی ضرورت ہے، اگر ایک کے ساتھ ایک فری کی آفر موجود ہے تو آپ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ آپ کو ایک کلو ٹائمر درکار ہیں مگر پیکنگ پانچ کلو کی ہوئی ہے یا پھر پانچ کلو خریدنے پر ڈسکاؤنٹ ہے تو آپ بچت کے لالچ میں خرید لیں گے اور وہ گھر میں پڑے گل سڑ جائیں گے۔ بعض چیزیں کسی کی دیکھا دیکھی خرید لی جاتی ہیں۔ اس فضول خرچی کے حق میں بات کرنے والوں کی آخری دلیل یہ ہوتی ہے کہ جسے رب نے دیا ہے وہ کیوں نہ خرچ کرے؟ آپ کی دولت، آپ کا سرمایہ اپنے لیے خرچ کرنے کا پورا حق ہے۔ آپ کے پاس، مگر

قدرتی وسائل دنیا بھر کے انسانوں کی مشترکہ ملکیت ہیں، ان کے ضیاع کا حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔ مغربی دانش ور تو آج اس نہج پر سوچ رہے ہیں اور غذائی اجناس کا ضیاع روکنے کے اقدامات تجویز کر رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جملے میں خرچ کرنے کے سب سلیقے اور قرینے سکھا دیے کہ کھاؤ پیو، مگر اسراف نہ کرو۔

بھوک، غربت، بیماری اور قومی سیاست

عالمی ادارہ صحت نے آبادی کے لحاظ سے دنیا کے چھٹے بڑے ملک پاکستان میں اضافہ پذیر مہنگائی و بیروزگاری، نوکروٹ سے زائد لوگوں کے غربت کی لکیر سے نیچے چلے جانے اور 54 فیصد افراد کو مطلوبہ مقدار میں غذا میسر نہ ہونے پر اپنی شدید تشویش ظاہر کی ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق پاکستان میں روزانہ ہزاروں افراد غربت کی لکیر سے نیچے گرتے جا رہے ہیں۔ ایک رپورٹ کی رو سے مجموعی طور پر ملک کے 131 اضلاع میں 80 فیصد لوگ غذائی کمی کا شکار ہیں۔ آج سے تیرہ سال قبل پاکستان کا ایک فرد جو خورد و نوش کی اشیاء استعمال کرتا تھا اس وقت ان میں نہایت کمی واقع ہو چکی ہے۔ ملک کے بہت سے لوگ دن میں دو وقت کی بجائے ایک مرتبہ کھانا کھانے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ پاکستانیوں کی روزانہ کی خوراک میں گوشت، پھل اور دودھ عفا ہے۔ اقوام متحدہ کے شعبہ خوراک کے مطابق ہمارے ملک کی صرف ایک تہائی آبادی مہینے میں ایک بار مرغی کا گوشت یا مچھلی کھاتی ہے۔ پاکستان کے عوام چند سال قبل اپنی آمدنی جو اپنے طرز زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے وہ اس وقت غذاؤں کی اضافی قیمت پر صرف کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق کئی ممالک بشمول پاکستان کی نصف سے زائد آبادی گزشتہ تین سالوں میں خوراک کی قیمتیں 80 فیصد سے زیادہ بڑھنے سے اپنی تین چوتھائی آمدنی خوراک پر خرچ کر رہے ہیں۔ معاشی مشکلات کا شکار پاکستانی عوام کی قوت خرید عالمی سطح پر کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے سے معیشت مسلسل کمزور ہوتی جا رہی ہے جو ایک تشویش ناک امر ہے۔ ملک میں رہائش اور علاج معالجے کی سہولتوں کی کمی ہے۔ آج ہماری تنگ دستی کو بری طرح متاثر کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستان کی دو تہائی سے زائد آبادی اخراجات زندگی حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے تجربہ کار اور مستند ڈاکٹروں سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا علاج کرانا تو درکنار معائنہ کروانے کی سکت نہیں رکھتی اور

نیتجاً ہمارے نو نہال طبی سہولتیں میسر نہ ہونے سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافے سے پاکستانیوں کی اکثریت ناصر ف زبردست مالی مشکلات کا سامنا کر رہی ہے بلکہ معاشی زبوں حالی کے باعث ملک کی بڑی آبادی مختلف ذہنی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ روزمرہ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی اہم وجہ آئے روز پٹرولیم کی قیمتوں میں کیا جانے والا اضافہ بھی ہے۔ پٹرولیم کی قیمتیں بڑھنے سے ملکی معیشت پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں کیونکہ پٹرول مہنگا ہونے سے ٹرانسپورٹ کے کرائے بڑھ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں کھانے پینے کی تمام اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہیں۔ جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتوں کے آئے روز بڑھنے سے ایسا لگ رہا ہے کہ سستی اشیاء کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ بحرانوں میں سب سے سنگین غذائی بحران نے معیشت کو زبردست دھچکا پہنچایا ہے۔ غربت و افلاس نے ہماری کثیر آبادی کو اپنے پنجے میں دبوچا ہوا ہے۔ پاکستان میں معاشی زوال کی وجہ سے زندگی کے امکانات مخدوش ہوتے جا رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں انتہائی فکر مند ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پچھلے دس سالوں میں پاکستان میں غربت کی شرح میں تیس فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ کمر توڑ مہنگائی سے خصوصاً کم تنخواہ دار طبقے کے لیے زندگی عذاب بن گئی ہے۔ کچھ لوگ عیش و عشرت کی زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں مگر دوسرا طبقہ جینے کے لیے غذائی سہولتوں سے بھی محروم ہے۔ عالمی بینک کی رپورٹ کی رو سے جنوبی ایشیائی ممالک میں غربت بڑھنے کی ایک اہم وجہ زرعی شعبے میں سرمایہ کاری کی کمی ہے۔ بنگ کے مطابق اگر خوراک کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو اس سے پاکستان کے مزید ایک کروڑ سے زائد لوگ غربت کا شکار ہو جائیں گے۔ اس وقت پاکستان میں افراط زر کی 12 فیصد شرح خطے کے دیگر ممالک بالخصوص بھارت اور بنگلہ دیش سے زیادہ ہے جبکہ قوت خرید کے انتہائی کمزور پڑ جانے کی

وجہ سے پاکستان میں لوگوں کے بنگلہ دیش و بھارت کے مقابلے میں کھانے پینے کی اشیاء پر ماہانہ اخراجات بھی کم ہیں۔

ایک سروے کے مطابق 11-2010ء میں پاکستان کے 43 فیصد خاندانوں کے معاشی حالات کمزور ہوئے ہیں۔ عالمی اداروں نے حال ہی میں شدید غذائی بحران کے شکار 36 ممالک میں پاکستان کو بھی شامل کیا ہے۔ غذائی بحران کی وجہ سے گزشتہ سال آٹے جیسے بنیادی ضرورت زندگی کے لیے عوام کو قطاروں میں لگ کر گھنٹوں بعد آٹا لینا نصیب ہوا۔ اب بھی ملک کے کئی شہروں میں آٹے کی قلت ہے۔ حکمرانوں کی عدم توجہی کے باعث مستقبل قریب میں بھی غذائی بحران کی سنگینی میں کمی کے کوئی آثار نہیں دکھائی دے رہے۔ اس وقت ملکی معیشت کساد بازاری کا شکار ہے۔ ہوشربا مہنگائی اور بے روزگاری نے غریبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے اور اس وقت غریب مزدور کو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

غربت و افلاس ہی دراصل بہت سی پریشانیوں اور بیماریوں کا اولین سبب ہے۔ دور غلامی میں اپنی بھوک اور افلاس کو سات سمندر پار سے آئے ہوئے سفید فارم حکمرانوں سے منسوب کیا جاسکتا تھا مگر دورِ وزادی کے 65 سالوں میں بھی اس میں افاقہ نہیں ہو سکا جس کی سب سے بنیادی وجہ ہماری حکومتیں ہیں۔ ہمارے ملک کے سیاسی طور پر بہت کمزور ہونے کی وجہ سے بھی غربت کم نہیں ہو رہی۔ ملک کو غربت کی گہرائیوں سے نکالنے کا فریضہ حکومتیں ہی سرانجام دیتی ہیں مگر اس حوالے سے ہم بحیثیت قوم مجموعی طور پر اب تک بد قسمت ثابت ہوئے ہیں۔ اقوامِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ قیاس آرائیوں اور پیش گوئیوں سے قوموں کا مستقبل روشن ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ مستقبل تب ہی درخشاں و تابناک ہو سکتا ہے جب ہم اس کے لیے عملاً فعال ہوں۔ آخر میں

ہمارے عرض کرنے کا مقصد کسی کو ڈرانا ہرگز نہیں تاہم لرزہ خیز حقائق سے چشم پوشی دھوکہ دہی کے مترادف ہے۔

لائوسٹاک کو فروغ دینے کے محرکات

ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والے شعبہ زراعت کو ترقی دینے اور اجناس کے ساتھ ساتھ لائوسٹاک کی پیداوار میں اضافے اور ڈیری فارمنگ کے فروغ کے لیے حکومت نے اب تک کیا اقدامات اٹھائے ہیں اور ان کے نتائج کیا برآمد ہوئے ہیں ان کا جائزہ لینے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ ملک میں موجودہ ڈیری فارمنگ کے نتیجے میں بالخصوص دودھ کی پیداوار کتنی ہے۔ مختلف اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ پاکستان میں دودھ کی کل سالانہ پیداوار تقریباً 27 ملین ٹن ہے جو زیادہ تر گائے اور بھینس سے حاصل ہوتا ہے جبکہ بھیڑوں، بکریوں اور اونٹنی کا دودھ بھی اس میں شامل ہے تاہم اس کا تناسب پانچ فیصد ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دودھ کی پیداوار کا تقریباً 70 فیصد بھینس اور 25 فیصد گائے سے حاصل ہوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق دودھ کی سالانہ پیداوار میں اضافہ درحقیقت گائے بھینسوں کی تعداد میں اضافہ آجانے کا مرہون منت ہے جبکہ انفرادی سطح پر فی کس جانور کی پیداواری صلاحیت کم ہے جس نے ڈیری فارم کی صنعت پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ دوسری طرف بیکٹیریا کے باعث پیدا ہونے والے امراض کی وجہ سے بہت سارے دودھیل جانور مر جاتے ہیں یا ان کی پیداوار میں بہت زیادہ کمی واقع ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق گل گھوٹو مویشیوں کا متعدی مرض برسات کے موسم میں نمودار ہوتا ہے جس سے جانور کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ چھوٹی عمر کے جانوروں میں یہ مرض زیادہ ہوتا ہے۔ یہ مرض زیادہ تر نشیبی اور مرطوب علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ مرض بیمار جانور کی رال، گوبر اور مریض جانوروں کی چھوڑی ہوئی خوراک کے ذریعے تندرست جانوروں کو منتقل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فارم پر کام کرنے والے کارندے، کھیاں اور چیچڑیاں بھی اس مرض کے پھیلانے کا باعث بنتی ہیں۔ اس مرض کا مخفی عرصہ ایک سے دو دن ہوتا ہے۔ ابتدا میں کچھ جانور علامات ظاہر کیے بغیر مر جاتے ہیں۔

مریض جانور کو تیز بخار ہوتا ہے اور سانس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ آنکھوں اور ناک سے پانی بہتا ہے، جانور کا منہ کھلا اور زبان باہر نکل آتی ہے۔ سانس میں تنگی کے باعث سانس لینے کے ساتھ خراٹے دار آواز دور سے سنی جاسکتی ہے بالآخر جانور ایک دو دن میں دم گھٹنے سے مر جاتا ہے۔ جانوروں کو متعدد امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو حفظ ماقدم کے طور پر بیماری کا موسم شروع ہونے سے قبل اس بیماری کی ویکسینیشن کروائی جائے۔ کامیاب ڈیری فارمنگ کے لیے موزوں بھی یہی ہے کہ ایسے تمام محرکات اور وجوہات پر جو صحت میں خلل ڈالنے کا باعث ہو سکتی ہیں مکمل قابو پایا جائے تاکہ اس صنعت کی شرح منافع بہتر ہو سکے اور فارمر کی معاشی ضروریات پوری ہو سکیں۔ علاوہ ازیں کسی بھی موثر وسیع اینٹی بائیوٹک کا استعمال کریں۔ اس مرض کی روک تھام کے لیے جانوروں کو گل گھوٹو کی ویکسین سال میں دو مرتبہ یعنی مئی جون اور نومبر دسمبر کے مہینوں میں کروائی جائے۔

چورے ماریبلیک کارٹر کا مرض برسات کے موسم میں بہت زیادہ پھیل جاتا ہے۔ یہ متعدی بیماری عموماً چھوٹے جانوروں میں آتی ہے۔ زیادہ تر چھ ماہ سے تین سال کی عمر تک کے جانور اس کا شکار ہوتے ہیں۔ اس مرض کا سبب ایک جراثیمہ کلو سٹریڈیم ہے جو عام طور پر مٹی میں پایا جاتا ہے اور خاصاً سخت جان ہوتا ہے۔ ناموافق حالات میں یہ سپور کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس حالت میں کئی سالوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ خوراک اور پانی کے ذریعے یا سانس اور زخم کے راستے جسم میں داخل ہو کر بیماری پیدا کرتا ہے۔ مویشیوں میں اس مرض کا حملہ اچانک اور شدید ہوتا ہے۔ متاثرہ جانور سست ہو جاتے ہیں، کھانا کم کر دیتے ہیں، جگالی کرنا چھوڑ دیتے ہیں، درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے اور نبض کی رفتار بھی تیز ہو جاتی ہے۔ جسم کے زیادہ گوشت والے حصوں مثلاً رانیں، شانے، گردن اور چھاتی پر ورم ہو جاتا ہے۔ جانور اکڑ جاتا ہے اور چلنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ کھڑا

نہیں رہ سکتا اس لیے لیٹ جاتا ہے اور بے ہوش ہو کر مر جاتا ہے۔ بعض اوقات جانور کوئی علامات ظاہر کیے بغیر مر جاتا ہے۔ اس مرض کے علاج کے لیے کوئی بھی وسیع الاثر اینٹی بائیوٹک استعمال کریں۔ اگر بلیک کوارٹر سیرم دستیاب ہو تو اس کا ٹیکہ بھی مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اس مرض کے باعث ہلاک ہونے والے جانوروں کو زمین میں گہرا گڑھا کھود کر دبا دیں۔ بیمار جانوروں کو تندرست جانوروں سے الگ کر لیں اور ان کا بچا ہوا چارہ اور خوراک ضائع کر دیں۔ جانوروں کے باڑوں کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے کسی بھی مؤثر جراثیم کش محلول کا سپرے کریں۔ اس مرض سے بچاؤ کے لیے حفاظتی ٹیکہ سال میں ایک دفعہ مارچ میں لگوائیں۔

انتھرکس ایک متعدی اور مہلک بیماری ہے جو انسانوں اور جانوروں دونوں میں پائی جاتی ہے۔ جانوروں میں یہ مرض عموماً برسات کے موسم میں ہوتا ہے۔ اس مرض کا سبب ایک جراثیم ہے سی لس انتھرکس ہے جو پینے کے پانی، چارہ یا گھاس کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر بیماری کا سبب بنتا ہے۔ یہ بیکٹیریا جسم میں سپور بناتا ہے جو خون پر حملہ آور ہوتے اور خون کو بگاڑ دیتے ہیں اور اس میں آکسیجن کم ہو کر کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھ جاتی ہے۔ مرض کی ابتداء اچانک اموات سے ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ تندرست جانوروں کو ہر سال اگست میں انتھرکس کی ویکسینیشن کروائی جائے تاکہ وہ اس مرض سے محفوظ رہیں۔ اس مرض سے ہلاک ہونے والے جانور کو زمین میں گہرا گڑھا کھود کر دبا دینا چاہئے۔

جانوروں کو تندرست رکھنے کے ضمن میں یہ امر اہم ہے کہ ان کی خوراک، رہائش کی جگہ، کھانے پینے کے برتن، کھریاں وغیرہ معیاری اور صاف ہوں۔ تندرست اور صحت مند جانوروں میں کمزور جانوروں کی نسبت بیماریوں کے خلاف زیادہ قوت مدافعت ہوتی ہے تاہم مندرجہ ذیل امور کو

احسن طریقے سے انجام دے کر بہت حد تک بیماریوں سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ جانوروں کو ہمیشہ معیاری، متوازن اور جراثیم سے پاک خوراک فراہم کریں۔ خوراک کی فراہمی میں جانور کی عمر، کام کی نوعیت اور پیداواری کارکردگی کو ضرور مد نظر رکھیں۔

ان کے نظام انہضام کو فعال بنانے کی غرض سے سبز چارہ، ونڈہ اور خشک چارہ مناسب مقدار میں فراہم کریں۔ جانوروں کو پانی کی مسلسل ضرورت رہتی ہے اس لیے ان کو صاف ستھرا تازہ اور وافر مقدار میں پانی دیں۔ سردیوں میں پانی نیم گرم اور گرمیوں میں قدرے ٹھنڈا ہونا چاہئے۔ جانوروں کو گنداپانی ہر گز نہ پینے دیں۔ بصورت دیگر جانور سانس کی بیماریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ان کی آنکھیں اور گلا بھی متاثر ہو سکتا ہے۔

کرمی امراض سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ جانوروں کو کسی بھی لمبے عرصے کے لیے ایک چراگاہ میں نہ چرایا جائے کیونکہ ایسی زمینوں پر بیماریوں کے جراثیم خاص طور پر طفیلی کرم بڑی تیزی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ چراگاہ کو مناسب حصوں میں تقسیم کر کے استعمال کیا جائے اور ایسے حصے جو استعمال ہو چکے ہیں ان کو زیر کاشت لایا جائے اس طرح بیماریوں کا انسداد ممکن ہے۔ باقاعدگی کے ساتھ اندرونی کرموں سے بچاؤ کی ادویات پلائی جائیں۔ کرمی امراض سے بچاؤ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چراگاہوں کے نزدیک سیم کے پانی کو جمع نہ ہونے دیا جائے۔ جانوروں کی صحت کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ ان کو باقاعدگی سے نہلایا جائے۔ بیرونی کرموں سے بچاؤ کے لیے گندگی کے ڈھیر کو شیڈ سے مناسب فاصلے پر رکھیں تاکہ کھیاں وغیرہ جانوروں کو تنگ نہ کر سکیں۔ فارم میں جانوروں کی تعداد میں اضافے کی غرض سے نئے خریدے گئے جانوروں سے متعلق یہ تسلی کر لیں کہ ان کو کوئی مرض تو لاحق نہیں اس مقصد کے لیے ان کو پہلے دو ہفتوں کے

لیے علیحدہ رکھیں اور ان کا بغور معائنہ کریں۔ اگر وہ اس دوران تندرست رہیں تو انھیں دوسرے جانوروں کے ساتھ شامل کر دیں۔ ماہرین کی ان تجاویز پر عمل کر کے ناصر ف ملک میں ڈیری فارمنگ کو فروغ دیا جاسکتا ہے بلکہ جانوروں کو بیماریوں سے محفوظ بنا کر ان کی نسل بھی بڑھائی جاسکتی ہے جس کا فائدہ گوشت اور دودھ کی پیداوار کی صورت میں نکلتا ہے۔

باب پنجم

معیشیت

وسائل اور مسائل

روزنامہ آواز، 28 نومبر 2018 ص 4

پاکستان کے قدرتی و افرادی وسائل کی فراوانی کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے قیام کے وقت یہ خوشخبری سنادی تھی، پھر وقتاً فوقتاً پاکستان کے وسائل کی خبریں آتی رہیں تاہم کبھی ان کو تلاش کرنے کی سنجیدہ کوشش بھی کی گئی مگر یا تو لا حاصل رہی یا پھر مشکلات کا شکار ہو گئی۔ یہ اطلاع ملی کہ سندھ گیس پر تیر رہا ہے، یعنی اس صوبے میں ہر جگہ گیس و تیل بڑی مقدار میں موجود ہے۔ اس بات کا غلام مصطفیٰ جتوئی سے ایک دفعہ ذکر کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ اس گیس کو آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دیا جائے، پھر پنجاب میں بڑی مقدار میں تیل اور سونے کے ذخائر کا تذکرہ دنوں تک اخبارات میں میں ہوتا رہا۔ ویسے بھی تقسیم ہندوستان سے پہلے اٹک کے قریب سے تیل نکلتا ہے اور راولپنڈی میں ایک ریفائنری ہے اور یہ شاید واحد فیکٹری تھی جو پاکستان کے حصے میں آئی تھی۔ پھر کہا جانے لگا کہ بلوچستان میں معدنیات کی بہتات ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے معدنیات نہیں نکالی جاسکیں، اس کے بعد ریکوڈک میں تانبے اور سونے کے ذخائر دریافت ہو گئے جس کی اصل مالیت کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ 100 مربع کلومیٹر کے یہ ذخائر قریباً 1400 بلین ڈالر کے ہیں، 2004ء میں نواب اکبر بگٹی کا کہنا تھا کہ جو کمپنی کوئی معدنی دولت نکاتی ہے اس کو 70 سے 75 فیصد حصہ ملتا ہے اور زمیندار کو 25 سے 30 فیصد حصہ ملتا ہے لیکن ریکوڈک میں پاکستان اور ایک غیر ملکی کمپنی کے درمیان تنازع ہوا تو عالمی عدالت سے رجوع کیا گیا جہاں سے وہ کمپنی اپنے حق میں فیصلہ حاصل کر چکی ہے مگر معلوم نہیں کہ ریکوڈک پر کسی کا زور چلتا ہے، آیا وہاں سے سونا نکالا جا رہا ہے یا ابھی کانیں بند پڑی ہیں۔ پھر ایک آسٹریلیو

کمپنی نے اطلاع دی تھی کہ گلگت بلتستان کے پہاڑوں میں سونا ہے، یہ بات اس لیے درست ہو سکتی ہے کہ گلگت بلتستان اور اس کے ملحق علاقوں میں جہاں دریا نکلتا ہے وہاں مقامی لوگ دریائی ریت کو چھانٹتے اور اس سے سونا نکالنے کی سعی کرتے ہیں اور تصدیق بھی کرتے ہیں کہ ان کو اکثر سونے کے ذرات مل جاتے ہیں۔ چند ماہ قبل پاکستان کے عبوری وزیر خارجہ حسین عبداللہ ہارون نے انکشاف کیا تھا کہ پاکستان کی سمندری حدود میں اتنی مقدار میں تیل موجود ہے جتنا کہ کویت کے پاس ہے اور مین کمپنی وہاں سے تیل نکالنے پر راضی ہے، اس نے پاکستان کو زر ضمانت بھی جمع کرا دیا ہے۔ اسی طرح ابھی تک پاکستان کی بحری حدود میں ہیرے اور موتیوں کے علاوہ مچھلی سبزی اور دیگر اشیاء بڑی مقدار میں موجود ہیں جو پاکستان کی غذائی ضروریات کو کافی حد تک پوری کر سکتی ہیں اور ساتھ ساتھ بڑا زر مبادلہ بھی کما کر دے سکتی ہیں۔ صرف مچھلی اور جھینگے کو لے لیں تو یہ ہماری زر مبادلہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔ بھارتی بحریہ کے ایڈمرل حضرات یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ پاکستان میں مچھلی کی صنعت کو فروغ دینے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی بلکہ سچ بات کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں مچھلیوں کی کوئی صنعت سرے سے موجود ہی نہیں ہے، ہم صرف مچھلی پکڑ سکتے ہیں، اگر اس میں سرمایہ کاری کی جائے تو جو مچھلی ضائع ہو جاتی ہے وہ بچ سکتی ہے اور پاکستان کی آمدنی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کو صنعت کے درجے پر لایا جائے، اس کو محفوظ کرنے اور عالمی معیار پر لا کر فروخت کرنے سے پاکستان کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ تھر سے کونڈہ کی بڑی مقدار کا حصول ممکن بنالیا گیا ہے، پھر سیاحت کی صنعت کو فروغ دینے سے پاکستان میں ڈالروں کی ریل پیل ہو سکتی ہے یا دنیا بھر کی کرنسیوں کی بھرمار ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف گلگت بلتستان پاکستان کو 50 ہزار میگا واٹ بجلی فراہم کر سکتا ہے لیکن پاکستان میں ٹرانسمیشن لائنز اس کا وزن نہیں اٹھا سکتیں۔ ایسا ملک جس کے پاس آمدنی کے مختلف ذرائع ہیں

مگر وہ اپنی افرادی قوت کو متحرک کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے، وہ ملک کنگال ہونے کے قریب ہے اور اس کا وزیر اعظم سعودی عرب، چین، ملائیشیا سے مدد کے حصول میں لگا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ لوگ پاکستان میں سرمایہ کاری کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ وہ کہیں نوے کی دہائی کی طرح قومیا نہ لی جائے، دوسرے سیاستدانوں کو یہ خطرہ ہے کہ وہ کچھ کرتے ہیں اور ملک خوشحال ہو جاتا ہے تو اس کا مزہ لوٹنے کے لیے کوئی اور حکمران آ جاتا ہے، اس لیے وہ پاکستان کو ترقی دینے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ پاکستان کے عوام لا تعلق ہو گئے ہیں، امن وامان، مساوات، انصاف کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ پاکستان سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں اسے کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔ امپورٹ بڑھی ہوئی اور ایکسپورٹ گھٹ گئی ہے، سرمایہ دار یہاں کے ماحول، انغوا برائے تاوان اور امن وامان کی وجہ سے ملک چھوڑ گیا مگر دوسرے ملکوں میں بھی ان کا سرمایہ محفوظ نہیں رہا تو شاید وہ لوٹ آئیں۔ حکمرانوں کی جو کھپ آتی ہے اس کے ساتھ جس قسم کے لوگ وزیر بن کر آ جاتے ہیں وہ بھی پاکستان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، کوئی منصوبہ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ لوگ دوسرے ملک جا کر پیسے کمائیں اور زر مبادلہ پاکستان بھیج دیں۔ کرپشن اس قدر بڑھ گئی ہے جیسے وقت کا قانون ہو، پھر قرضہ جات 95 بلین ڈالر تک پہنچ گئے ہیں، ان کی ادائیگی کا مسئلہ درپیش ہے تو قرضہ لینا ضروری ہو گیا ہے اور قرضہ بھی اتنا چاہئے کہ قسطیں ادا ہو جائیں اور ساتھ ساتھ اس کا سود بھی، اس کے بعد ترقی کی راہ کو ہموار کیا جاسکتا ہے کہ اگر آئی ایم ایف سے قرضہ لیا گیا تو وہ پاکستان کی شرح نمو چار یا پانچ فیصد سے آگے نہیں بڑھنے دے گا جبکہ قرضہ جات کے جنجال سے نکلنے کے لیے پاکستان کو 8 فیصد شرح نمو کم از کم دس سال تک درکار ہے، اس کے لیے پاکستان کو 20 بلین ڈالر کی ضرورت ہوگی پھر جو طریقہ چین اور پاکستان نے وضع کیا ہے کہ یو آن اور روپے میں تجارت کی جائے وہ بھی ایک ذریعہ ہے، پاکستان کو زراعت کے لیے

نئے کھیت بنانا ہوں گے اور نئی فصلیں اگانا ہوں گی، جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ اس کے لیے پانی کی ضرورت ہے اور پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے ڈیم چاہئیں، جس میں بہت لاگت آئے گی مگر مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق پاکستان کو ہر طرح کے منصوبے بنانا ہوں گے، بہت سے لوگ میڈیا پر تنقید کر رہے ہیں کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے، یہ تاثر غلط ہے۔ میڈیا وہی لکھ اور دکھا رہا ہے جو اسے نظر آرہا ہے کہ موجودہ حکومت کو اپنی معاشی اور سیاسی ٹیم پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ ملک چلانے جیسے سنجیدہ کام موجودہ ٹیم کے بس کی بات نہیں۔ عمران خان کی ایمانداری پر شک نہیں کیا جاسکتا مگر ان کے وزرا بھی تجربہ کار، ہوشیار اور اپنے کام کے ماہر ہوں تو ہی ہر مشکل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

قومی واٹر پالیسی

روزنامہ آواز، 5 اکتوبر، 2018ء، پس 4

یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اگر پاکستان نے پانی کے ذخائر محفوظ کرنے کے لیے فوری اقدامات نہ کیے تو 2025ء تک پاکستان پانی کے شدید بحران کا شکار ہو جائے گا جو ملک کے لیے دہشت گردی سے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس اہم قومی مسئلے پر نئے وزیر اعظم عمران خان اور چیف جسٹس ثاقب نثار نے بھاشا، دیامیر اور مہمند ڈیم فنڈز قائم کیا جس میں ملک اور بیرون ملک سے عطیات آرہے ہیں جس پر قوم ان کی مشکور ہے کہ وہ نئے ڈیمز بنانے کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم پاکستان عمران خان کے حالیہ کراچی کے دورے میں بزنسمنوں نے ایس ایم منیر کی سربراہی میں ڈیمز کے فنڈ میں 11 کروڑ روپے عطیہ دیا۔ عمران خان کے مطابق ایوب دور میں پاکستان کی شاندار صنعتی ترقی، سستی ہائیڈرو بجلی کی مرہون منت تھی، طویل عرصے بعد پاکستان میں ایک فضا پیدا ہوئی ہے کہ ہم ملک کے مفاد میں یہ ڈیمز ہر حال میں بنائیں گے اور نئے ڈیمز بنانے کے لیے ہمیں 130 ارب روپے سالانہ عطیات چھ سال تک درکار ہوں گے۔ مستقبل میں پانی کے بحران پر فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز (FPCCI) نے پانی کے ذرائع پر ایک اعلیٰ سطح ایڈوائزری کمیٹی قائم کی ہے جس میں ملک کے معروف پروفیشنلز، ریسرچ اسکالرز اور اکیڈمیوں کے سربراہان، پانی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور ممتاز صنعت کار شامل ہیں۔ اس سلسلے میں کمیٹی کی کراچی، اسلام آباد اور لاہور میں کانفرنس لائن پر دو میٹنگز ہو چکی ہیں۔ میٹنگ میں وزارت پانی کی اپریل 2018ء کی قومی واٹر پالیسی کا جائزہ بھی لیا گیا اور ToRs کے لیے ایک ضلعی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ کمیٹی کے حالیہ اجلاس میں واٹر کے چیئرمین

لیفٹیننٹ جنرل (ر) منزل حسین نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ جبکہ لاہور سے افتخار علی ملک، رحمت اللہ جاوید، اسلام آباد سے کریم عزیز ملک، کراچی سے ایس ایم منیر، غضنفر بلور، زبیر طفیل، مظہر ناصر، طارق حلیم، وحید احمد، حنیف گوہر، پروفیسر ڈاکٹر معظم علی خان، محمد سلمان، مظہر تالپور، سمیع خان، این ای ڈی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد عمران، ڈاکٹر زہت خان، سابق سیکرٹری اور ایس راجپوت، ایوب قطب اور وقار الدین صدیقی نے اجلاس میں شرکت کی۔ اجلاس میں ماہرین نے اس اہم موضوع پر اپنی تجاویز پیش کیں جو قارئین سے شیئر کی جا رہی ہیں۔ پاکستان میں جنوب مشرق میں 125 اہلی میٹر اور شمال مغرب میں 750 ملی میٹر بارشیں ہوتی ہیں، اس طرح ہمیں سالانہ 132 رب کیوبک میٹر (BCM) پانی بارش سے حاصل ہوتا ہے جبکہ ملک میں 9 لاکھ ٹیوب ویلوں سے BCM59 پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں تربیلا ڈیم سے 10.38، منگلا ڈیم سے 48.59 نہروں سے اور 19 بیراجوں سے مجموعی BCM 171 پانی حاصل ہوتا ہے۔ دنیا میں اوسطاً 5920 کیوبک میٹر پانی فی کس دستیاب ہے جبکہ ہمیں 1950ء میں 5300 کیوبک میٹر فی کس پانی دستیاب تھا جو گزشتہ 65 سالوں میں 81 فیصد کمی کے بعد 2015ء میں صرف 1014، کیوبک میٹر فی کس رہ گیا ہے۔ دنیا میں کم از کم پانی کا اوسط 1000 کیوبک میٹر فی کس ہے یعنی دوسرے لفظوں میں پاکستان میں اس وقت لوگوں کو اوسطاً کم ترین پانی دستیاب ہے۔ پانی کی قلت کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ آبادی میں اضافے سے 2020ء میں یہ کم ہو کر 915 کیوبک میٹر اور 2025ء میں 850 کیوبک میٹر فی کس ہو جائے گا لہذا ملک کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ پانی کے نئے ذخائر تعمیر کیے جائیں۔ پاکستان میں 2000 میں زرعی شعبے میں پانی کی کھپت 29 فیصد صنعتی شعبے میں 23 فیصد اور گھریلو صارفین میں 8 فیصد تھی لیکن 2016ء تک زرعی شعبے میں پانی کی کھپت 88.9 فیصد (1 ملین ایکڑ فٹ) صنعتی شعبے میں 3.4 فیصد (428 ملین ایکڑ فٹ)، گھریلو

صارفین 15 فیصد (81 ملین ایکڑ فٹ) اور ماحولیات کے شعبے میں 1.54 فیصد (1.2 ایکڑ فٹ) یعنی مجموعی 124.92 ملین ایکڑ فٹ ہو گئی۔ اگر ہم خطے میں مختلف ممالک میں ڈیمز کا جائزہ لیں تو چین میں 87000 ڈیمز ہیں جن میں 5000 بڑے ڈیمز ہیں، بھارت میں 3200 ڈیمز جبکہ پاکستان میں صرف 150 ڈیمز ہیں جن میں 10 ڈیمز بڑے ہیں۔ پاکستان کے پاس صرف 11.55 ملین ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے ہم صرف تیس دن کا پانی ذخیرہ کر سکتے ہیں جبکہ بھارت 120 دن اور امریکہ 900 دن تک پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس طرح پاکستان کی پانی ذخیرہ کرنے کی فی کس مقدار 150 کیوبک میٹر، چین میں 200 کیوبک میٹر، آسٹریلیا اور امریکہ میں 5000 کیوبک میٹر ہے۔ 6 ستمبر 2018، کو سینٹ کی خصوصی اسٹینڈنگ کمیٹی کو بریفنگ میں وار سانسے بتایا کہ 19-2018ء میں پاکستان کو ریمج کی فصل کے لیے 35 سے 45 فیصد پانی کی کمی ہے۔ تربیلا ڈیم پانی ذخیرہ کرنے کی 1500 فٹ کی اونچی ترین سطح حاصل کر چکا ہے اور اس طرح ہمارے پانی کے مجموعی ذخائر 9.3 ملین ایکڑ فٹ تک پہنچ گئے ہیں جو گنجائش سے 32 فیصد کم ہیں جبکہ گزشتہ سال ہمارے پانی کے ذخائر گنجائش سے 24 فیصد کم تھے جس کی وجہ سے اس سال کاٹن کی فصل 14 ملین ہیلز کے ہدف سے کم رہنے کی توقع ہے۔ پاکستان اپنے دستیاب پانی کو ذخیرہ نہ کر کے سالانہ 30 سے 35 ارب ڈالر کا نقصان اٹھا رہا ہے جبکہ کالا باغ، بھاشا اور اکھوڑی ڈیم کی تعمیری لاگت صرف 25 ارب ڈالر ہے۔ پانی کی کمی کی وجہ سے آج پاکستان پانی سے صاف اور سستی بجلی پیدا کرنے کی بجائے فرنس آئل، قدرتی گیس اور ایل این جی سے مہنگی بجلی پیدا کر رہا ہے جس سے ملک کا انرجی کس خطے کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں نہایت مہنگا ہے جو ہماری پیداواری لاگت میں اضافہ اور ملکی ایکسپورٹس کو غیر مقابلاتی بنا رہا ہے۔ ملک میں پانی کے نئے ذخائر بنانے کے ساتھ ساتھ ہمیں پانی کے ضیاع کو روکنے کے لیے بھی اقدامات کرنے ہوں گے۔ قومی واٹر پالیسی

میں بتایا گیا ہے کہ شہروں کا پچاس فیصد پانی کھیتوں تک پہنچنے میں ضائع ہو جاتا ہے جس کی بنیادی وجہ نہروں کا پختہ نہ ہونا ہے۔ ہمیں ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے گلشیرز کے پگھلنے سے حاصل ہونے والے پانی کو بھی محفوظ کرنا ہو گا۔ زرعی شعبے میں ڈرپ ایری گیشن ٹیکنالوجی سے پانی کی بچت کی جاسکتی ہے جبکہ صنعتی و بلدیاتی شعبے سے حاصل ہونے والے پانی کو ری سائیکلنگ کر کے دوبارہ استعمال کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کو ساحلی علاقوں میں پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ (PPP) کے تحت ڈی سیلی نمیشن پلانٹ لگانے چاہئیں تاکہ کراچی اور دیگر ساحلی شہروں میں خلیجی ممالک کی طرح ڈی سیلی نیشن پلانٹ سے پینے کا پانی حاصل ہو سکے۔ پاکستان میں اس وقت پانچ بڑے ڈیمز ہیں جس میں تربیلا، منگلا، میرانی، وارسک اور سبک زنی ڈیم شامل ہیں ان میں سے زیادہ تر ڈیمز 1960ء سے 1975ء کے دوران بنائے گئے لیکن اس کے بعد پانی کے ذخائر کے لیے کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ 2025ء، زیادہ دور نہیں لہذا قومی سلامتی اور بقا کے لیے حکومت اور تمام سیاسی جماعتوں کو متحد ہو کر ملک میں نئے ڈیمز تعمیر کرنے کی پالیسی ترجیحی بنیادوں پر تشکیل دینا چاہئے تاکہ ہر سال بارش کے 70 سے 80 فیصد پانی کو بحیرہ عرب میں ضائع ہونے سے روکا جاسکے۔ فیڈریشن کی کمیٹی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اپریل 2018ء کی قومی واٹر پالیسی کی سفارشات پر عملدرآمد کیا جائے ورنہ پاکستان مستقبل قریب میں پانی کے شدید ترین بحران کا شکار ہو سکتا ہے۔

معیشت کی بحالی کا عزم

روزنامہ آواز 20 ستمبر 2018، ص 4

وزیراعظم عمران خان کا قوم سے پہلا خطاب جو عام آدمی کا نقطہ نظر ہے، انتہائی متاثر کن اور امید افزا تھا۔ اس تقریر سے عوام خصوصاً نوجوانوں کی توقعات بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ان بلند و بانگ عزائم کے اہم مقاصد میں حزب اختلاف کی ممکنہ احتجاجی تحریک کو غیر مؤثر بنانا اور بلدیاتی الیکشن میں کامیابی حاصل کرنا بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ معیشت کی بحالی عام آدمی کی فلاح و بہبود اور پاکستان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے عظیم مقاصد کے حصول کے لیے ہم چھ تجاویز پیش کر رہے ہیں جن پر اگلے 45 دنوں میں لازماً عملدرآمد کرنا ہو گا۔

(1) لوٹی ہوئی اور ناجائز دولت سے ملک کے اندر بنائے ہوئے اثاثوں پر مروجہ قوانین کے تحت ٹیکس اور حکومتی واجبات وصول کرنے ہوں گے۔ ان اثاثوں کی مکمل تفصیلات ریکارڈ میں موجود ہیں۔ اگر وزیراعظم سیکرٹریٹ کی نگرانی میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مدد سے ان ناجائز اثاثوں کی نشاندہی کرے جو ٹیکس حکام سے خفیہ رکھے گئے ہیں، حکومتی واجبات کی وصولی شروع کر دی جائے تو اگلے چند ماہ میں کم از کم 1500 ارب روپے کی اضافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اس رقم سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ قدم نہ اٹھایا گیا تو یہ ایک قومی المیہ ہو گا۔ بد قسمتی سے گزشتہ چند روز میں اس ضمن میں منفی اشارے ملے ہیں کیونکہ اس سے طاقتور طبقوں کے ناجائز مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ یہ نئی حکومت کا ٹیسٹ کیس ہو گا۔

(2) معیشت کی بحالی کے لیے بنیادی نوعیت کی کچھ اصلاحات کرنا انتہائی ضروری ہیں۔ ان میں وفاق اور صوبوں کی سطح پر ہر قسم کی آمدنی پر مؤثر طور سے ٹیکس عائد اور وصول کرنا، جنرل سیلز ٹیکس کی شرح 7.5 فیصد سے زیادہ نہ رکھنا، معیشت کو دست آویزی بنانا، سرمائے کے فرار اور کالے دھن کو سفید ہونے سے روکنا، انکم ٹیکس آرڈیننس کی شق 111(4) کو منسوخ کرنا، غیر منقولہ جائیدادوں کی رجسٹریشن مارکیٹ کے نرخوں سے کم پر نہ کرنا اور باہر سے آنے والی ترسیلات کو تجارتی خسارے کو کم کرنے کی بجائے ممکنہ طور پر سرمایہ کاری کے لیے استعمال کرنا شامل ہیں۔ گزشتہ 25 برسوں سے مختلف حکومتیں ان میں سے بیشتر اصلاحات کرنے کے وعدے کرتی رہی ہیں۔ آئی ایم ایف بھی اس ضمن میں حکومتوں پر رسد باؤڈالتا رہا ہے۔ ان اصلاحات سے معیشت لازماً بہتر ہو جاتی چنانچہ فنڈ نے ان شرائط پر کبھی اصرار نہیں کیا۔ یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ ان اصلاحات سے طاقتور طبقوں اور اشرافیہ کے مفادات متاثر ہوتے ہیں چنانچہ مختلف حکومتوں نے ان اصلاحات سے اجتناب کیا ہے۔ گزشتہ 5 برسوں میں تحریک انصاف کی حکومت نے بھی ان اصلاحات سے اجتناب کیا ہے جو آئین میں اٹھارویں ترمیم ساتویں قومی مالیاتی ایوارڈ کے بعد سے صوبوں کے دائرہ اختیار میں آتی ہیں اور وہ تحریک انصاف کے 2013ء کے منشور کا حصہ بھی تھیں۔

(3) اگلے چند ہفتوں میں وفاق اور تینوں صوبوں کے نظر ثانی شدہ بجٹ پیش کیے جانے چاہئیں۔ ان میں نکتہ نمبر 2 میں پیش کی گئی تجاویز شامل کی جائیں۔ تحریک انصاف کے 203ء کے منشور میں تعلیم صحت کی مد میں جی ڈی پی کا 70 فیصد اور پیپلز پارٹی نے 11 فیصد مختص کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر ان کو پورا کرنے کی کوشش گزشتہ برسوں میں کی ہی نہیں گئی۔ اب کم از کم اس مد میں جی ڈی پی کا 7،6 فیصد لازماً مختص کیا جائے۔

(4) وزیر اعظم عمران خان کی تقریر میں ناجائز دولت بیرونی ملکوں سے واپس لانے کے عزم کا اظہار متعدد بار کیا گیا ہے۔ نئی حکومت اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے ان رقوم کی واپسی پر بہت زیادہ انحصار کر رہی ہے حالانکہ اگلے چند برسوں میں اس ضمن میں کسی بڑی کامیابی کا امکان نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ قانون سازی کر کے ملک سے سرمائے کے فرار کو روکا جائے۔ ہم برس ہا برس سے یہ تجویز دیتے رہے ہیں کہ کھلی منڈی سے خریدی ہوئی بیرونی کرنسی کو بینکوں کے کھاتوں کے ذریعے تعلیم و علاج معالجے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے ملک سے باہر بھیجنے پر پابندی لگادی جائے۔ اب یہ قدم فوری طور پر اٹھانا ہوگا۔

(5) نیب کو مضبوط بنانے کا وزیر اعظم کا عزم خوش آئند ہے مگر اس سے پہلے نیب کے ایگزیکٹو بورڈ اور انتظامیہ کا احتساب ضروری ہے۔ نیب کے موجودہ چیئرمین نے دعویٰ کیا ہے کہ اپنے قیام سے اب تک نیب نے قومی خزانے میں 269 ارب روپے جمع کرائے ہیں۔ حالانکہ قومی خزانے میں جمع کرائی جانے والی مجموعی رقوم کا حجم 112 ارب روپے سے بھی کم ہے۔ گزشتہ برسوں میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے نیب سے متعلق جو ریمارکس دیے ہیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ (1) لوٹی ہوئی دولت کو قومی خزانے میں واپس لانے کے نام پر جاری کردہ ایمنسٹی اسکیم میں حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ نگران حکومت نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے توسیع کرا دی تھی حالانکہ اول ملکی اثاثوں پر جن کی تفصیلات ریکارڈ پر موجود ہیں، ایمنسٹی دینے کا کوئی جواز تھا ہی نہیں ملکی اثاثوں پر غیر ضروری ایمنسٹی دینے سے قومی خزانے کو پانچ سو ارب روپے سے زائد کا نقصان ہوا ہے اور دوم یہ شق برقرار رکھی گئی کہ ایمنسٹی حاصل کرنے کے باوجود ناجائز رقوم باہر ہی رکھی جاسکتی ہیں۔ یہ ایک قومی المیہ ہے کہ ایک طرف پاکستانی شہریوں کی بیرونی ملکوں میں رکھی ہوئی ناجائز دولت کی معلومات حاصل کرنے اور واپس لانے کی بظاہر کوششیں کی جا رہی

ہیں اور دوسری طرف ایمنسٹی اسکیم کے تحت ان ناجائز رقوم کو باہر ہی رکھنے کی بھی اجازت دے کر قومی مفادات کا سودا کر لیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ صدارتی آرڈیننس کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ سپریم کورٹ نے لوٹی ہوئی دولت کو پاکستان واپس لانے کے لیے از خود نوٹس آئین کی شق (184)(3) کے تحت لیا تھا یعنی ان ناجائز رقوم کو باہر رکھنے سے عوام کے بنیادی حقوق متاثر ہو رہے ہیں۔ نئی حکومت یہ تمام حقائق سپریم کورٹ کے سامنے بھی رکھنے چاہئیں۔

وزیراعظم عمران خان کے پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے وعدے سے ملک کے طول و ارض میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے مگر مندرجہ ذیل حقائق کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(1) قرآن کے احکامات کے تحت حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ صاحب نصاب مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرے اور ان رقوم کو مسلمان مستحقین تک پہنچانے کا نظام وضع کرے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نظام زکوٰۃ کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے لیے حکومت کیا اقدامات اٹھاتی ہے۔

(2) یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ ملک میں کئی سو قوانین قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ وطن عزیز میں سودی نظام معیشت و سودی نظام بینکاری پوری آب و تاب سے پروان چڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ آئین کی شق (30) میں کہا گیا ہے کہ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ سود کا جلد از جلد خاتمہ کر دیا جائے۔ وزیراعظم کو یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ وفاقی کابینہ اور ان کے مشیروں میں وہ صاحبان تو شامل نہیں ہیں (الف) جو غیر اسلامی متوازن نظام بینکاری کے اجرا کے ذمہ دار ہیں (ب) جن کے خلاف سپریم کورٹ میں کوئی مقدمہ زیر سماعت ہے اور (ج) جنہوں نے انتہائی مالدار ہونے کے باوجود بینکوں سے قرضے معاف کرائے ہیں۔

(3) سیٹ بینک کے شریعہ بورڈ کے چیئرمین اور ممبران اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ نظام بینکاری غیر اسلامی ہے مگر برس ہا برس سے وہ اس غیر اسلامی نظام کی پشت پر متوازی موجود ہیں۔ سود کا مقدمہ وفاقی شرعی حالت میں گزشتہ 4 برس سے التوا کا شکار ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ نئی حکومت سود کو حرام قرار دینے اور اسلامی بینکاری کو شریعت کے تابع بنانے کے لیے مشاورت کر کے پارلیمنٹ میں قرارداد منظور کرائے اور شرعی عدالت سے یہ مقدمہ واپس لے لیا جائے۔

ترقیاتی منصوبوں کی ناکامی

روزنامہ آواز 13 فروری 2016، ص 4

ترقی پذیر دنیا میں اقتصادی اور سماجی ترقی کے ان گنت مضحکہ خیز ترقیاتی منصوبوں کی بری طرح ناکامی اور کتنے ہی نتیجہ خیز منصوبوں کی شاندار کامیابی کے بعد سیاسیات اقتصادیات، ابلاغیات، انتظامی علوم اور دوسرے سماجی علوم کے ملاپ سے انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ، ڈویلپمنٹ سائنس، ڈویلپمنٹ مینجمنٹ اور ڈویلپمنٹ کمیونی کیشن جیسے انقلاب آخریں علوم ظہور پذیر ہو کر مکمل باڈیز آف نالج کی شکل اختیار کر گئے اور آج اعلیٰ سطح پر یونیورسٹیوں میں پڑھائے جارہے ہیں۔ اقوام متحدہ اپنی سرحدوں کا احترام، اقوام کے حق خود ارادیت، عالمی علاقائی قیام امن اور تمام رکن ممالک کی برابری کی حیثیت قائم کرنے کے اپنے ایجنڈے میں تو کامیاب سے زیادہ ناکام رہی جہاں تک اس کے ڈبلیو ایچ او، ایف اے او، یونیسف، آئی ایل او، یونیسکو، یو این ایف پی اے اور یو این ڈی پی جیسے بین الاقوامی ترقیاتی اداروں کے مقاصد اور اہداف کے حصول کا تعلق ہے، بلاشبہ اس میں اقوام متحدہ کے ان عالمی اداروں کی کامیابیاں انسانیت کے لیے رحمت بن گئیں۔ سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی جیسے بڑے ناموں والے معتبر ادارے تو ویت نام، افغانستان، عراق، کویت، پاکستان (کشمیر اور سیچن کے حوالے سے) اور کئی ممالک کی سرحدوں کا احترام قائم رکھنے میں ناکام رہے۔ مسئلہ کشمیر و فلسطین، کشمیریوں اور فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کو بدستور غصب رکھنے کے حوالے سے عالمی برادری خصوصاً جنوبی ایشیا کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یونیسف مغربی یورپی ممالک میں جس طرح کروڑوں یتیم بچوں کو سہارا دے کر انھیں نارمل زندگی میں لائی، ایف اے او نے گندم اور دوسری

اجناس کے روایتی بیجوں کے مقابل انقلاب آفریں وراثییز دریافت کر کے عالمی آبادی کی تیزی سے بڑھتی خوراک کی ضرورتوں کے مطابق اہتمام کیا، جس طرح ڈبلیو ایچ او کے فارمولے نمکول (او آر ایس) نے یومیہ ایک لاکھ بچوں کی اسہال (ڈائیریا) سے اموات پر قابو پایا، چیچک اور پولیو جیسے المناک امراض کا خاتمہ کیا، واضح رہے کہ پولیو پاکستان سمیت تین ملکوں کے سوا (باقی افغانستان اور ریاست فلسطین) دنیا سے ختم ہو چکا۔

چائلڈ لیبر پر کافی حد تک قابو پایا گیا اور دنیا بھر میں زچہ و بچہ کی صحت (Reproductive Health) اور صحت عامہ کی حالت کو کافی حد تک بہتر بنایا گیا۔ اسی طرح چائلڈ اینڈ ویمین ڈیولپمنٹ، ماحولیات، ترقیاتی ابلاغ، چھوٹا کنبہ، جاننے کا حق (Right to Know)، ترقی جاریہ

(Sustainable Development)، گڈ گورننس اور ای گورننس جیسے جو انقلاب آفریں اور روبہ عمل و نتیجہ خیز تصورات پیش کیے، یہ عالمی ادارے کے وہ عظیم کارنامے ہیں جس پر پورا عالمی معاشرہ فخر کر سکتا ہے کہ یہ اسی کا کریڈٹ ہے۔

اقوام متحدہ کے قیام سے اب تک کوئی 70 سالوں کی یہ کامیابیاں جہاں انسانیت کی بھلائی پر اقوام متحدہ کے اتحاد و اتفاق کا نتیجہ ہے، وہاں اس کی اصل حقیقت ترقیات کے یہ ہی علوم ہیں جن کا ظہور ناکامیوں اور کامیاب تجربات سے 50 کے عشرے کے بعد ہونا شروع ہوا۔ پاکستان، جو اقوام متحدہ کا ابتدا سے سرگرم رکن رہا ہے کہ یونیسف جیسے عالم کیچ ایجنٹ کا قیام پاکستان کے عالمی ادارے میں مستقل مندوب پروفیسر بطرس بخاری کی تجویز پر ہی پیرس میں ہوا۔ واضح رہے کہ یونیسف نے ترقی پذیر دنیا (جو تین عشرے تک تھرڈ ورلڈ کہلائی گئی) کے بچوں کے سروائیول، ان کے تحفظ اور نشوونما (ترقی) میں باکمال خدمات انجام دی ہیں لیکن یہ پاکستان کا کتنا بڑا المیہ ہے

کہ جس ممبر ملک کی تجویز پر تباہ شدہ یورپ کے کروڑوں یتیم بچوں کی بحالی کا عالمی فنڈ فرانس میں اپنے کام کی تکمیل کے فوراً بعد ہی بچوں کی نگہداشت اور نشوونما کے مستقل عالمی ادارے (یونیسف) میں تبدیل ہو گیا، وہ ملک آج دنیا کے ان چند ممالک میں شامل ہے جو 100 فیصد خواندگی کا ملینیم گول پورا نہ کر سکے۔ یہ ہدف تعلیم سب کے لیے کے نام پر یونیسف نے ترقی پذیر دنیا کے لیے رکھا تھا۔ یہ ہی رونا ہم اپنی اقتصادی ترقی کی بربادی کے حوالے سے روتے ہیں کہ پاکستان وہ ترقی پذیر ملک ہے جس نے ابتدا میں ہی پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کو ڈیزائن کر کے ترقی کی پانچ سالہ منصوبہ بندی سے ترقیاتی عمل کی رفتار بڑھانے کا ماڈل بطور مثال تمام ترقیاتی ممالک کے لیے قائم ہی نہیں کیا اسے کامیابی سے اختیار کیا، جس کی تقلید جنوبی کوریانے کی اور وہ ایشین ٹائیگر بن گیا اور ہماری معیشت آج اپنے بنگلہ دیش بن جانے والے کٹے بازو کی معیشت کے مقابل بھی کسی نچلے درجے پر ہے۔ ہمارے ہاں 60 کے عشرے میں جو زرعی انقلاب برپا ہوا، اس سے ہم کتنی ہی زرعی پیداوار میں خود کفیل ہوئے۔ ان کی برآمد شروع کی، اب ہماری آخری کیش کراپ چاول بھی کپاس کے بعد بطور برآمدی فصل روبہ زوال ہے۔ قالین، جوتے، گارمنٹس، پیکھے اور سائیکل وغیرہ کی برآمدات پہلے ہی برباد ہو گئیں۔

واضح رہے کہ 1053ء میں امریکی امداد کے ساتھ ویلیج ایڈ کے نام سے دیہی ترقی کا جو پروگرام متعارف کیا گیا، وہ اس وقت دنیا میں دیہی ترقی کا دوسرا بڑا پروگرام تھا۔ اس میں دیہات کی اقتصادی، سماجی ترقی کے لیے یہ پہلا سبق دیا گیا کہ دیہات کی تمام ترقیاتی سرگرمیوں participator approaches یعنی بینی فشریز (دیہاتی بھائی بہنوں) کی شرکت کو لازمی بنایا جائے۔ اس کے لیے امریکہ میں دیہی ترقی کی حکمت عملی کریسنٹ کلب کی طرز پر چاند تارا کلب بنائے گئے۔ اس کے تحت دیہاتی بھائی ہلال کی شکل میں (نیم دائرے) میں بیٹھ جاتے، درمیان میں

(تارے کی جگہ) مقامی لیڈر بیٹھتا، وہ اپنے مشترک مقامی مفادات، مسائل اور حل کی نشاندہی کرتے، اس کے مطابق ان سے تعاون کیا جاتا اور انھیں براہ راست ترقیاتی سرگرمیوں میں شامل کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن چند ہی ماہ میں یہ مالا مال پروگرام ہر دو صوبوں مشرقی اور مغربی پاکستان میں بھی دیہاتی بھائیوں کے ہاتھوں سے نکل کر افسر شاہی کے ہاتھوں میں آنے لگا۔ اس کے ایڈمنسٹریٹر بیورو کریٹ بننے لگے۔

اوپر سے نچلی سطح تک یہ سایہ بد دیہاتیوں کی دیہی ترقی کے پروگرام پر چھا گیا جس میں دیہاتی غائب ہو گئے تو دیہی ترقی کا عمل بھی بد انتظامی، افسر شاہی کی فرعونیت اور پروگرام اور اس کے بنی فشریز کی لاطعلقی میں تبدیل ہو گیا۔ 1997ء میں ترقی پذیر ممالک میں ترقیاتی منصوبوں کی ناکامی کی بڑی وجہ بیڈ گورننس کے مقابل اعلیٰ ترین سے لے کر نچلی سطح تک کے مسئلے کے حل گڈ گورننس کا جدید تصور عملیات کی تمام تر تفصیلات اور علمی بنیادوں کے ساتھ پاکستان میں متعارف کرایا گیا۔ یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام نے اس کے لیے وفاقی حکومت کو فنڈنگ کی جس سے پاکستان میں گڈ گورننس گروپ (G3) قائم ہوا جس نے پاکستان میں بیمار اور بار بار ناکام ہونے والے ترقیاتی عمل اور حکومتی عدم استحکام سے نجات حاصل کرنے کے لیے تین جلدوں پر مشتمل تجاویز تیار کیں۔ حکومت وقت تو اپنی بیڈ گورننس سے بعد میں ختم ہوئی لیکن G3 اور اس کے کام کو عملاً ٹھکانے پہلے ہی لگا دیا گیا تھا۔ واحد فائدہ فقط اتنا ہوا کہ گڈ گورننس ہمارے سیاسی ابلاغ میں شامل ہو گئی جس کا آج شدت سے رونا رویا جا رہا ہے۔

Participatory Approach یعنی ترقیاتی منصوبے کے بنی فشریز کی مکمل ترقیاتی عمل خصوصاً منصوبہ سازی، پالیسی و فیصلہ سازی اور عملدرآمد میں عملاً شرکت کو یقینی بنانا گڈ گورننس کا روح

رواں (بنیادی اصول) ہے۔ آج ہمارے حکمرانوں کا اس اپروچ سے تصادم ان کا دھیرہ بن گیا ہے۔ یہ ترقیاتی اقدام، جس کا چرچا حکومت انتہائی سیاسی انداز میں اور مقاصد کے لیے کرتی ہے، پر پہلے سوال یہ اٹھتے ہیں کہ یہ کس کے دماغ کی پیداوار ہے، کس نے اس ضرورت کا احساس دلایا، کس نے مطالبہ کیا؟ یہ ہے ہی کیوں؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ عوام کے سامنے کیوں نہیں لائی جارہی ہیں۔ فرنٹ مین تو یہ ہے پیچھے کون ہے؟ پارلیمنٹ میں کیوں زیر بحث نہیں لایا گیا؟ اس کے ساتھ ہی اقربا پروری کی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ تعلق داریوں کی ترقیاتی عمل میں شرکت کی نشاندہی خبروں سے ہوتی ہے۔ پھر یہ ترقیاتی منصوبے جنہیں حکومت پورے دعوے سے عوام دوستی اور عوام کرپشن سمجھتے ہیں متنازع ہو جاتے ہیں۔ ترقی جاریہ کا تصور اور ضرورت اس میں سے مائنس ہو جاتی ہے۔ پھر حکمران ناقدین پر الزام لگاتے ہیں اور ناقدین حکمرانوں پر کہ یہ دونوں عوام اور ترقی کے دشمن ہیں۔ جب تک ہمارے حکمران ترقیاتی علوم سے منہ موڑ کر اپنی عقل کل سے فیصلے کر کے ان پر جنگی بنیاد پر عمل کرتے رہیں گے، عوام اور حکمرانوں میں یہ جنگ جاری رہے گی نہ حکومتی استحکام نصیب ہو گا نہ عوام کو فلاح لیکن جن کے نصیب میں پہلے ہی بہت کچھ ہے وہی اس جنگ کے بڑے فاتحین بنتے ہیں۔ عوام کے نمائندے تو خاموش ہی رہیں گے کہ وہ اسٹیٹس کو کی پیداوار ہیں۔ عوام خود ہی سوچیں کہ اب کیا کرنا ہے؟

خوراک کی قلت ایک عالمگیر مسئلہ

روزنامہ آواز، 2013

امریکہ کے صدر باراک اوباما نے مسلسل دوسری بار صدارتی انتخابات جیتنے کے بعد عوام سے خطاب کرتے ہوئے اپنی پہلی تقریر میں دنیا کو یقین دلایا کہ برسوں کی جنگ ختم ہو رہی ہے۔ ہم امن کا قیام چاہتے ہیں۔ مبصرین کے مطابق نائن الیون کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے شروع کی گئی جنگ میں سب سے زیادہ اسلامی ممالک متاثر ہوئے اور غربت اور بھوک کے خلاف جنگ دنیا بھر رہی ہے۔ 2000ء میں پوری دنیا نے مل کر غربت کو جڑ سے اکھاڑنے کا عہد کیا تھا۔ اقوام متحدہ کے پرچم تلے عالمی غربت و افلاس اور بھوک کے خاتمے کے لیے جو وعدے ترقی یافتہ ملکوں نے ترقی پذیر ملکوں سے کیے تھے۔ نائن الیون کے ڈنکے سے وہ تمام وعدے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ امریکہ نے ترقی یافتہ ملکوں کو غربت کے خلاف جنگ لڑنے کی بجائے ان کو اپنا اتحادی بنا کر آتش و آہن برسانے پر مامور کر دیا لیکن جلد ہی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو معلوم ہو گیا کہ غربت اور بیروزگاری نے ان کے ملکوں میں بھی اپنے پنچے گاڑ دیے ہیں۔ 2010ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ترقی یافتہ ملکوں میں 19 ملین لوگ غربت اور بھوک کے ستائے ہوئے تھے اور اب میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔ امریکہ میں 47 لاکھ سے زائد شہری دو وقت کے کھانے کے لیے ریاست پر انحصار کر رہے ہیں۔ 200ء میں نئے ہزارے کے آغاز کے موقع پر اقوام متحدہ نے میلینیم ترقیاتی اہداف کا تعین کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ 2015ء تک عالمی غربت کی شرح کو نصف کر دیا جائے گا لیکن 2012ء تک غربت میں مزید اضافہ ہی ہوا ہے، کمی کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ ہزاروں گھرانوں کے چشم و چراغ

گل ہو رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے پروگرام برائے خوراک کے مطابق ہزاروں بچے روزانہ بھوک اور کم غذائیت سے مر رہے ہیں۔ میں اور اس وقت دنیا کی کل آبادی سات ارب، سات کروڑ 81 لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور ہر لمحے اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تین ارب انسان روزانہ ڈھائی امریکی ڈالر سے کم پر گزار کر رہے ہیں۔ دنیا کے 40 کروڑ لوگوں کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا۔ 27 کروڑ افراد کو بھی سہولتیں میسر نہیں۔ 64 کروڑ بچوں کے پاس سرچھپانے کی جگہ نہیں۔ عالمی بینک نے عالمی پیمانہ غربت ایک یا دو ڈالر یومیہ آمدنی کا پیمانہ مقرر کیا ہے۔ 200ء میں جب عالمی غربت اور بھوک کے خلاف جنگ کا آغاز کیا گیا تھا تو اس وقت چھ ارب سے زائد آبادی میں سے ایک ارب دس کروڑ سے زائد افراد کی آمدنی ایک ڈالر یومیہ سے کم تھی اور دو ارب 20 کروڑ سے زائد افراد یومیہ دو ڈالر سے کم پر زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ اس طرح دنیا کی نصف آبادی ایسی تھی جو غربت و افلاس عسرت و تنگ دستی بھوک اور بیماریوں سے جنگ لڑ رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ انتہائی غریب، تنگ دست اور نادار تھے جبکہ دنیا کے 10 فیصد امیر لوگ دنیا کی 85 فیصد دولت پر قابض ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے باعث دنیا میں دولت کی تقسیم کچھ یوں ہو کر رہ گئی ہے کہ شمالی امریکہ جس کی کل آبادی دنیا کی کل آبادی کا فیصد 5.2 ہے وہ دنیا کی کل دولت کا 34.50 فیصد سمیٹے ہوئے ہے۔ یورپ کی کل آبادی دنیا کی کل آبادی کا دس فیصد کے قریب ہے۔ انھوں نے دنیا کی کل دولت کا تقریباً 30 فیصد حاصل کر رکھا ہے۔ ایشیا کی کل آبادی دنیا کی کل آبادی کا 22 فیصد ہے اور دنیا کی کل دولت کا محض 25.6 فیصد حصہ ہی ان کے حصے میں آیا ہے۔ افریقہ دنیا کی کل آبادی کا دس فیصد اور سرمایہ دارانہ نظام نے ان کے پلے، دنیا کی کل دولت کا صرف 0.54 فیصد ہی ڈالا ہے۔ آمدنی ہی اتنی کم ہو تو ظاہر ہے کہ عالمی غربت بڑھے گی۔ اقوام متحدہ کی نائب سیکرٹری جنرل نے کہا ہے کہ براعظم افریقہ میں 13 ملین افراد فاقہ کشی سے دوچار ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی معیشت میں

بہتری لانے بلکہ ان ملکوں میں غربت ختم کرنے یا غربت کے خلاف جنگ میں ان ملکوں کا ساتھ دینے کے لیے ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ملکوں کو تجارت میں آسانی سمیت تمام سہولتیں مہیا کریں۔ 2008ء کے معاشی بحران کے نتائج یوں ظاہر ہو رہے ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں بیروزگاری اور لوگوں کو رہائش کی سہولتوں میں کمی آتی جا رہی ہیں۔ روزگار نہ ملنے کے سبب ان ملکوں میں بہت سے لوگوں کی آمدنی کم سے کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یونان، اٹلی، سپین کی معیشت بگڑتی چلی جا رہی ہیں۔ امریکہ قرضوں میں دب چکا ہے جس کا کل ریاستی قرضہ ستمبر 2021ء تک 16.15 ٹریلین ڈالر تک پہنچ چکا ہے۔ ستمبر 2012ء تک بیروزگاری کی شرح 7.8 فیصد سے بھی بڑھ چکی ہے لہذا امریکی صدر نے کہا ہے کہ ہم امن چاہتے ہیں۔ جنگ کی دہائی ختم ہو گئی لہذا امریکہ کو جلد ہی غربت اور بھوک کے خلاف جنگ میں ترقی پذیر ممالک کا ساتھ دینا ہو گا جب امریکہ میں بھی بہترین وقت آسکتا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ غریب جنوبی ایشیائی ممالک بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں رہتے ہیں۔ غربت کے متعلق ایک مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ ہر تیسرا پاکستانی غربت کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔ کل 18 کروڑ کی آبادی میں سے 5 کروڑ 87 لاکھ افراد غربت کی لکیر سے پچھلی سطح پر کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں 19 فیصد غریب لوگوں کا تعلق پنجاب سے ہے، سندھ میں 33 فیصد ہیں۔ بلوچستان کی نصف آبادی غربت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ خیبر پختونخواہ کے 32 فیصد لوگ انتہائی غریب ہیں۔ یہ رپورٹس بھی منظر عام پر آچکی ہیں کہ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران مہنگائی، بیروزگاری اور افغانستان میں امریکی جنگ کے منفی اور مضر اثرات کے باعث پاکستان کی معیشت انتہائی کمزور ہو جانے کے باعث تقریباً ایک کروڑ 80 لاکھ افراد مزید غربت کی پٹلی میں پھنس چکے ہیں۔ ورلڈ فوڈ اینڈ ایگریکچرل آرگنائزیشن کے سربراہ

نے حالیہ پریس کانفرنس میں واضح کیا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں خوراک تو وافر مقدار میں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ 7 کروڑ افراد کو پوری روٹی بھی میسر نہیں ہے۔ 37 برس قبل نیلہ میں منعقد عالمی ادارہ خوراک کے تحت ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ کے وزیر نے کہا تھا کہ آئندہ دس سال میں کوئی بچہ بھوکا نہیں سوائے گا۔ 2000ء میں اقوام متحدہ نے اپنے علیکم مقاصد میں واضح کیا تھا کہ 2015ء تک عالمی غربت نصف کر دی جائے گی۔ ترقی یافتہ ممالک نے غربت کے خلاف جنگ میں ترقی پذیر ممالک کی مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن نتائج بالکل ہی برعکس نکلے ہیں۔ عالمی منڈی میں خوراک کی قیمتوں میں مسلسل کمی آجانے سے آئندہ چند برسوں میں صورت حال انتہائی مخدوش ہو جائے گی۔ اب دنیا کے تمام ملکوں کو مل کر ہی عالمی غربت اور بھوک کے خلاف جنگ کو تیز کرنا ہو گا تا کہ دنیا بھر کے ممالک میں تیزی سے بڑھتے ہوئے غربت میں اضافے کو روکا جاسکے۔

زرعی شعبہ کی بد حالی، ذمہ دار کون؟

روزنامہ آواز 20 فروری 2011، ص 4

صدی کے بدترین سیلاب نے ملکی تاریخ میں پہلے ہی سے بد حالی کا شکار شعبہ زراعت کو کئی برس پیچھے دھکیل دیا ہے۔ غیر ملکی اداروں کی رپورٹس کے مطابق خوف ناک سیلاب سے زرعی شعبہ کو تقریباً ڈھائی سو ارب روپے کا نقصان ہوا جس کے متاثرین میں ملکی زرعی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرنے والا چھوٹے کاشت کاروں کا بڑا طبقہ شامل ہے، جو تباہی اور غیر متوقع صورتحال سے دوچار ہوا جس کے منفی اثرات ناصرف زراعت بلکہ دیگر شعبوں پر ملک و قوم کو بھگتنے پڑیں گے۔ روایتی اور فرسودہ طریقہ کاشت کے باعث پاکستان میں شعبہ زراعت مسائل میں گھرا ہوا ہے جنہیں نہ کاشت کار ترک کرنے پر آمادہ ہے اور نہ ہی حکومتیں سنجیدہ ہو گئیں جس کے باعث مسائل جوں کے توں چلے آ رہے ہیں۔ ملک میں دستیاب 200 ملین ایکڑ اراضی میں سے یہ مشکل 50 ملین ایکڑ اراضی قابل کاشت حالت میں ہے جب کہ چھوٹے اور غربت زدہ کاشتکاروں میں مالی استطاعت نہ ہونے کے باعث نہ تو اسے ہموار کیا جاسکے اور نہ اس معاملے میں کسی سطح پر نتیجہ خیز کوششیں کی جاسکیں جس سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آبادی میں خوف ناک اضافہ غذائی قلت کے ایک واضح متوقع دور کو دعوت دے رہا ہے۔

سال 2010، بھی شعبہ زراعت کے لیے دیگر گزشتہ برسوں کی طرح پس ماندگی اور بد حالی کا سال ثابت ہوا۔ صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم کے معاملے پر تنازع ایک مستقل مسئلہ چلا آ رہا ہے۔ ملک کی 70-65 فیصد قابل کاشت اراضی نہری نظام سے سیراب ہو رہی ہے۔ اگرچہ ماضی میں پاکستان اور بالخصوص پنجاب کے نہری نظام کو دنیا بھر میں ایک خصوصیت اور اہمیت حاصل رہی

ہے لیکن حالیہ بدترین سیلاب نے ناصرف اسے نیست و نابود کر کے رکھ دیا ہے بلکہ مستقبل کے لیے بھی بحرانی صورت حال کے اندیشوں کو جنم دیا ہے۔ پاکستان میں فصلوں کی انشورنس کا انتظام 2008ء میں متعارف کروایا گیا لیکن کاشتکاروں کو قرضہ جات فراہم کرنے والے سب سے بڑے نیٹ ورک نے، جس میں زرعی ترقیاتی بینک کا شمار ہوتا ہے انشورنس سکیم کا آغاز کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جس کے باعث قدرتی آفات، سیلاب اور بیماریوں کی زد میں آنے والی فصلوں کے معاملہ پر کسان کو تحفظ حاصل نہ ہو سکا۔ حکومت کراپ انشورنس کی واضح پالیسیوں اور ان پر یقین عمل درآمد کا باقاعدہ و باضابطہ آغاز نہ کر سکی اور انتہائی محدود دپیما نے پر زمین داروں کو تحفظ حاصل رہا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس مالیاتی ادارے سے ملک بھر میں یہ مشکل پانچ لاکھ زمین دار قرض حاصل کرتے ہیں جبکہ 70 فیصد سے زائد کاشت کاروں کو رسائی حاصل نہیں اور یوں ان کی قیمتی فصلوں کو تحفظ حاصل نہیں۔

2010ء میں ملک بھر میں جاری واپڈا اور محکمہ آبپاشی کے پیشتر زیر تکمیل منصوبے مکمل نہ ہو سکے بلکہ فنڈز کی کمی، افسران کی عدم دلچسپی، سیاسی مداخلت، ڈیزائن میں غیر ضروری تبدیلیاں، امن و امان کی بگڑتی صورت حال، غیر ملکی انجینئرز اور فرمز کو عدم تحفظ جیسے معاملات سے منصوبے غیر ضروری طور پر تاخیر کا شکار ہو رہے ہیں۔ جن میں تونسہ بیراج کے مقام پر دریائے سندھ سے نکالی جانے والی کچھی کینال اور گول زم ڈیم شامل ہیں۔ بلوچستان کے زرخیز مگر بنجر اضلاع کچھی، نصیر آباد اور جھل مگسی میں نہری نظام متعارف کروانے کے لیے نکالی جانے والی کچھی کینال کا منصوبہ 2010ء میں مکمل ہونا تھا لیکن تا حال اس پر کام جاری ہے اور حکام کے مطابق فنڈز کی بروقت فراہمی سے 2010ء کے طے شدہ شیڈول کے برعکس 2012ء میں تکمیل ممکن ہے۔ بد قسمتی سے صرف تاخیر پر منتج نہیں ہو رہی بلکہ تین سال قبل تعمیر ہونے والے مین کینال کے پٹے کنکریٹ،

بینلز اور اس کا بیڈ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں جس کا خمیازہ صرف اور صرف کاشت کاروں کو بھگتنا پڑے گا۔ نہروں کی سالانہ دیکھ بھال میں سستی، پانی کی غیر متوقع قلت اور بجلی کے بدترین بحران نے کاشت کاروں کی کمر توڑ دی۔ گزشتہ ایک برس میں زرعی ٹیوب ویلز کے لیے بجلی کے نرخوں میں 70 سے 80 فیصد اضافہ ہوا جس کے تباہ کن اثرات ملک کے بارانی علاقوں میں فی ایکٹر کم پیداوار کی صورت میں سامنے آئے۔ قبل ازیں فلیٹ پاور ریٹ کا خاتمہ زراعت دشمن ثابت ہوا اور صرف ڈیرہ غازی خان، راجن پور اور ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقوں میں ایک ہزار سے زائد ٹیوب ویلز مستقل بنیادوں پر بند ہو گئے اور لاکھوں ایکڑ اراضی ایک بار پھر بھاری سرمایہ کاری کے باوجود بنجر اور ویران ہو گئی۔ ملک کے تمام چھوٹے بڑے ڈیمز میں پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش بتدریج کم ہو رہی ہے جس کی وجہ سے فی ایکڑ پانی کی کمی سامنے آرہی ہے اور نتیجتاً کاشت کار بھاری قرضے لے کر متبادل آپشن کے طور پر ٹیوب ویل نصب کروانے پر مجبور ہیں۔ جس سے پانی کے اضافی اخراجات برداشت کرنے پڑ رہے ہیں جب کہ پیداواری اخراجات میں بھی مسلسل اضافہ، اوپن مارکیٹ میں کم نرخوں کی صورت میں اسے قرضوں میں جکڑتا جا رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور ٹیچر کے فروغ میں اضافہ سے کاشت کار غریب سے غریب تر اور سرمایہ دار امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کی واضح مثال کسانوں سے اونے پونے داموں کما دی خرید اور بعد ازاں چینی کی پرچون مارکیٹ میں پچاس روپے فی کلو گرام دستیابی میں غیر معمولی اضافہ کے بعد 130 روپے فی کلو گرام فروخت شامل ہے جس کا فائدہ صرف اور صرف ذخیرہ اندوزوں کو حاصل ہوا۔ 2010ء میں ذخیرہ شدہ گندم کی بڑی مقدار کے سیلابی ریلے میں بہہ جانے کے باعث ہزاروں کاشت کار گندم نہ اگا سکے اگرچہ حکومت پنجاب نے کاشت کاروں کو فی ایکڑ کی شرح سے کھاد اور تیج فراہم کیے لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر رہی کہ انھیں بوائی کے وقت ڈی اے پی کھاد کے بجائے یوریا کھاد فراہم کی گئی

جس کی بوائی کے دوران قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق حالیہ سیلاب سے کپاس کی فصل بدترین تباہی سے دوچار ہوئی جس کے نقصان کا تخمینہ 170 ارب روپے لگایا گیا ہے جب کہ دیگر فصلوں میں کماد، دائیں اور چاول شامل ہیں۔ لائیو سٹاک بھی جو شعبہ زراعت کا سب سے سیکڑ ہے سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہا۔ وفاقی وزارت خوراک و زراعت اور لائیو سٹاک کے اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر میں ساڑھے چار لاکھ سے زائد چھوٹے، بڑے جانور ہلاک ہوئے جس سے ناصرف دودھ اور گوشت کی کمی ہوئی بلکہ متاثرہ اور بیمار جانوروں کی تعداد اموات سے بھی کہیں زیادہ ہونے کے باعث ان کی پیداواری صلاحیت بری طرح متاثر ہوئی۔ ناکافی حکومتی اقدامات لائیو سٹاک کی بحالی کے لیے مؤثر ثابت نہ ہو سکے۔ حکومت نے مویشیوں کی ہلاکتوں اور لائیو سٹاک فارمز کے نقصانات کے ازالہ کے لیے کسی سطح پر اقدامات نہیں اٹھائے۔ لائیو سٹاک سیکڑ ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود صورت حال کا حقیقی معنوں میں ادراک کرنے میں ناکام ہے۔ پنجاب اور سندھ کی حدود میں واقع دریائے سندھ کا طویل مغربی اور مشرقی کنارہ، جہاں سے خیبر پختونخوا اور بلوچستان کو بڑی مقدار میں دودھ اور گوشت فراہم کیا جاتا تھا، یہ روایتی لائیو سٹاک فارمنگ کا سب سے بڑا مرکز تصور کیا جاتا ہے، اب تاریخ کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے اور اس اہم ترین پٹی میں واقع بیٹ کی رونقیں سیلاب کے بعد تاحال بحال نہ ہو سکیں۔

گندم کی ریکارڈ اور بھر پیداوار کے باوجود ہم گندم درآمد کر رہے ہیں۔ گندم، دالیں، خوردنی تیل اور دیگر زرعی اجناس پر مشتمل درآمدات ڈیڑھ سو ارب روپے سالانہ سے زیادہ ہے اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو کسان کاشت کار ملکی زراعت اور حکومت کے لیے سنگین چیلنج ہے۔ جاگیرداری نظام کا تسلسل چھوٹے کاشت کاروں اور زراعت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور حکومتی سطح پر جب تک اس مسئلے کا حل تلاش نہیں کر لیا جاتا زرعی پسماندگی کا جاری سفر ختم

نہیں ہو سکے گا۔ سرکاری اراضی سمیت بڑے زمینداروں سے زمینیں واپس لے کر موثر سکیم شروع کی جائے۔ سبزیوں اور پھلوں کی برآمدگی کی حوصلہ افزائی، پانی کے زیاں پر قابو پانے، غیر معیاری مہنگی ملاوٹ شدہ پیسٹی سائیڈ برآمد، تیار اور فروخت کنندگان کے خلاف سخت ترین کاروائی، فلیٹ پاور ریٹ کی بجائی، کسان دوست پالیسی سیم و تھور کی روک تھام، زرعی اجناس کی جلد اور بروقت امدادی قیمتوں کے تعین سے زراعت کی ترقی کے سفر کا آغاز ممکن ہے۔ پاکستان میں گزشتہ برسوں میں زرعی شعبوں کی ترقی کے لیے ناقص منصوبہ سازی کے باعث 16 کھرب روپے ضائع ہو چکے ہیں۔ 66 ارب روپے سے کچھ کھالوں کو پختہ کرنے کی سکیم تاحال جاری ہے مگر اس منصوبے سے ایک کیوسک پانی ضائع ہونے سے نہیں بچایا جاسکا۔ زرعی تحقیق کا یہ عالم ہے کہ کپاس کی فصل پروائرس سے کسانوں کو سالانہ 20 سے 225 ارب روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اسی طرح گندم کی فصل پر بھی مختلف بیماریوں، پانی اور ناقص زرعی مداخل کے باعث 10 سے 15 ارب روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اسی طرح زرعی اجناس کی خریداری کا نظام انتہائی ناقص ہونے کے باعث کسانوں کو دھان، گنا، تیل دار اجناس اور گندم میں اب تک 180 ارب روپے کا نقصان ہوا ہے۔ زرعی مداخل میں زہریلی زرعی ادویہ، کھاد، پیچ اور ڈیزل کے بلیک مارکیٹنگ سے سالانہ 135 ارب روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ آئندہ ابرسوں میں زراعت کے لیے پاکستان میں روشن مستقبل کی توقع کرنا انتہائی مشکل ہے۔ جمہوری حکومت سے وابستہ توقعات سے کسانوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ آئندہ برسوں میں زرعی شعبے کو پانی اور توانائی کے شدید مسائل کا سامنا ہو گا۔ حکومت کو چاہیے کہ عوام کو پانی اور سستی توانائی کے منصوبے دے تاکہ زراعت کو تباہی سے بچایا جاسکے۔ اس دہائی کے آخری سال 2010ء میں قدرتی آفات، سیلاب اور زلزلے سے سب سے

زیادہ نقصان زراعت کو پہنچا۔ پاکستان کی تاریخ میں 2005ء کا زلزلہ اور 2010ء کے سیلاب نے جتنی تباہی مچائی ہے اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ 2005ء کے زلزلے سے صوبہ خیبر پختونخواہ میں زرعی شعبہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اسی طرح جنوبی پنجاب سمیت صوبہ سندھ میں 2010ء کے بدترین سیلاب سے صرف زرعی شعبہ کو 285 ارب روپے کا خسارہ ہوا۔ اس سے ملک کی نقد آور فصل کپاس کے ساتھ دھان اور کماد کی فصل کا 60 فیصد حصہ سیلاب کی نذر ہو گیا جس سے ایک کروڑ سے زائد کاشت کار اور زمیندار براہ راست سیلاب کی زد میں آئے۔ جن کی بحالی کے لیے حکومت کو اربوں ڈالرز درکار ہیں۔ ایک کروڑ سے زائد زر خیز زرعی زمینیں دریا برد ہو گئیں۔ اسی طرح 1998ء سے 2010ء تک کسانوں، کاشتکاروں اور زمینداروں کو مجموعی طور پر مختلف بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا جس میں پانی کا بحران سرفہرست ہے۔ بھارتی آبی جارحیت کے باعث جنوبی پنجاب کو سیراب کرنے والے دریا چناب، راوی، ستلج، جہلم اور پنجند، 50 فیصد سے زائد پانی سے محروم ہو گئے ہیں۔

سرکاری زرعی اداروں کی کارکردگی بھی رواں عشرے میں انتہائی مایوس کن رہی۔ زرعی تحقیقاتی ادارے سفید ہاتھی ثابت ہوئے جن کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ان کی نجکاری کا فیصلہ کیا گیا۔ موجودہ حکومت نے غیر ملکی کمپنیوں کو معیاری بیج تیار کرنے کے ٹھیکے دے دیے ہیں۔ اس طرح توانائی کے بحران سے زرعی شعبہ سب سے زیادہ متاثر ہو رہا ہے۔ حال ہی میں زرعی ٹیکس آبیانہ اور جی ایس ٹی کے نفاذ سے زیادہ نقصان بھی زراعت سے وابستہ افراد کو ہو گا۔ پاکستان میں زراعت واحد شعبہ ہے جس سے وابستہ افراد 100 فیصد ٹیکس ادا کرتے ہیں جب کہ اس کے برعکس انھیں ریونیو کے حساب سے سہولتیں نہیں دی جاتیں۔ پاکستان میں کاٹن **سیس اور شوگر کین سیس** کے فنڈز کسانوں کی فلاح و بہبود کی بجائے کرپشن کی نذر ہو رہے ہیں۔ بد قسمتی سے زرعی ملک میں

زراعت کو پسماندہ رکھنے کی پالیسیاں متعارف کروائی جا رہی ہیں۔ آئندہ برسوں میں زرعی شعبے کو ترقی دینے کے لیے حکومت کی بجائے پرائیویٹ سیکٹر کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ کسانوں کو اپنی مدد آپ کے تحت توانائی کے متبادل ذرائع تلاش کرتا ہوں گے۔ جدید زرعی ٹیکنالوجی کو اختیار کرنے کے لیے زراعت کو ٹیکس فری قرار دینا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ زرعی شعبے کی ترقی کے لیے 10 سالہ پروجیکٹس تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔

غذا اور تیل کا نیا بحران

عالمی سطح پر غذا اور تیل کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کے مسئلے پر بحر الکاہل، ایشیائی خطے کے ممالک میں شدید تشویش نے جنم لیا ہے جو سال 2007ء سے 2008ء کے بحران کی یاد کو تازہ کرتی ہے۔ سال 2010ء کے اوائل سے ہی غذا اور تیل کی قیمتیں مستقل بڑھ رہی ہیں تاہم یہ صورتحال اس خطے کے غریب اور بے بس افراد کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ 2011ء کے سروے میں ایسکیپ کے معاشی اور اقتصادی کمیشن نے تخمینہ لگایا ہے کہ تیل اور غذا کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے نتیجے میں 22 ملین مزید افراد غربت کی لکیر سے نیچے جاسکتے ہیں، میدان 19 ملین افراد کے علاوہ ہیں جو سال 2010ء میں بالکل اسی طرح متاثر ہوئے۔ سروے میں یہ بھی رپورٹ کیا گیا ہے کہ سال 2011 میں نہایت خراب حالات کے نتیجے میں غذا کی کمی میں افراط زر کا دو گنا اضافہ ہو گا جبکہ تیل کی اضافی اوسط قیمت 30 امریکی ڈالر فی بیرل تک پہنچ سکتی ہے۔ اس تناظر میں غربت کے حوالے سے میلینئم ڈویلپمنٹ گولز کے مقاصد کی تکمیل میں پانچ سال سے زائد عرصے تک کی تکمیل کی تاخیر ہو سکتی ہے۔ غذا اور تیل کی قیمتوں میں نئے مرے سے اضافے کے پیچھے کون سے عوامل کار فرما ہیں، ہمیں ان مسائل کو کیسے حل کرنا چاہئے؟ کیا صرف ڈومیسٹک پالیسی ہی اس کے لیے کافی ہوگی یا پھر ہمیں عالمی سطح پر پالیسی مطابقت کی ضرورت ہے؟ پاکستان کو نئے سرے سے ابھرنے والے غذا اور تیل کے بحران سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا چاہئے؟

خطے میں موجود مختلف ممالک میں غذا کی قیمتوں میں 35 فیصد سے زائد اضافہ ہوا ہے تاہم غذا کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کے پیچھے بہت سے عوامل کار فرما ہیں جس میں موسم کی خراب صورت حال کے نتیجے میں فراہمی میں مشکلات، غذا کی بائیو فیول میں تبدیلی، برآمدات پر پابندی، ذخیرہ

اندوزی اور غذا سے متعلق اشیائے صرف میں اندازے پر بنی صورت حال شامل ہے۔ علاوہ ازیں موسم کی خراب صورت حال کے باعث گندم کی پیداوار بہت متاثر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ گندم برآمد کرنے والے ممالک میں رشین فیڈریشن نے اگست 2010 میں برآمد پر پابندی کا اعلان کر دیا جس سے گندم کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ تیل کی قیمتوں میں اضافہ بائیو فیول کے ذریعے غذا کی قیمتوں پر شدید دباؤ ڈال رہا ہے۔ چونکہ اس طرح کے فیول کا گندم کے طور پر استعمال سامنے آرہا ہے اس لیے امریکہ میں گیہوں کی ایک تہائی پیداوار استھنول پروڈکشن کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ غذا کی قیمتوں میں حالیہ اضافہ مالیاتی سرمایہ کاری کی وجہ سے بھی ہے۔ درحقیقت ایسکیپ سروے میں کہا گیا ہے کہ تقریباً 300 بلین امریکی ڈالر سرمایہ کاری کے مقاصد کے لیے اشیائے صرف کی مارکیٹوں میں پہنچ چکے ہیں تاہم اس سطح کی سرمایہ کاری 2007 سے 2008ء کے مالیاتی بحران کے آغاز میں بھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ بہر حال اس خطے میں موجودہ ترقی پذیر ممالک میں تیل کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کی وجہ سے منفی تاثر سے متعلق خدشات بڑھتے جا رہے ہیں۔ عالمی معیشت کی بتدریج بحالی، امریکی ڈالر اور اہم کرنسیوں کی قدر میں کمی، تیل کی مارکیٹوں میں مالیاتی سرمائے کی آمد اور مشرق وسطیٰ میں حالی پولیٹیکل عدم استحکام، تیل کی قیمتوں میں اضافے کے اہم عناصر ہیں۔ بہر حال دنیا مانیٹری پالیسی کی ناکامی دیکھ چکی ہے کہ یہ پالیسی 1970ء میں افراط زر کو روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ سخت مانیٹری پالیسی نے عالمی معیشت کو جمود میں دھکیل دیا اس لیے قومی سطح پر مانیٹری پالیسی کے لیے پرانے طریقہ کار کو نظر انداز کرنے کی ضرورت ہے تاہم مانیٹری پالیسی کو سخت کرنے کے تاہم بجائے انتظامیہ کو فراہمی کی جانب توجہ دینی چاہئے جو غذا کی قیمتوں میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکس یا ٹیرف میں تخفیف کر کے بھی غذا اور تیل کی قیمتوں میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ تیل اور غذا کی قیمتوں میں کمی لائی جاسکتی

ہے۔ تیل اور غذا کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا مسئلہ صرف قومی سطح پر مؤثر طریقے سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مسائل کو حل کرنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے G-20 جو اقتصادی مسائل پر عالمی پالیسی کے اشتراک کا ایک اہم فورم ہے کو اہم کردار ادا کرنا ہو گا لہذا تیل اور غذا کی بدلتی ہوئی قیمتوں میں کمی لانے کے لیے G-20 کو حتمی طور پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تیل کی بدلتی ہوئی قیمتوں کا تعلق ہے تو اوپیک پروڈیوسرز کے مفاد کو پیش کرتا ہے جبکہ G-20 صارفین کے مفاد کی نمائندگی کرتی ہے تاہم یہ دونوں مل کر تیل کی مناسب قیمتوں کے معیار پر کام کر سکتے ہیں اور تیل کی قیمتوں کو محدود کرنے پر بھی رضا مند ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ G-20 تیل کے لیے عالمی اسٹریٹجک ذخائر بھی تشکیل دے سکتی ہے اور جنھیں بہت زیادہ طلب پر انھیں مہیا بھی کر سکتی ہے۔ جہاں تک غذا کی بدلتی ہوئی قیمتوں کا تعلق ہے تو G-20 فنانشل مارکیٹوں میں غذائی اشیائے صرف کے حوالے سے تخمینے پر مبنی کاروائی کو ایک اصول کے تحت چلا سکتی ہے اور یہ گندم کی بائیوفیل میں تبدیلی کے لیے ضابطہ بھی مسترد کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ G-20 ایکیپ کے ذریعے غیر رکن ممالک سے مشاورت کا طریقہ کار تشکیل دے کر اپنے اعتبار میں اضافہ کر سکتی ہے۔ پاکستان کو غذا اور تیل کے نئے بحران کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ تجویز کرنا خلاف عقل نہیں ہو گا کہ گزشتہ 40 ماہ سے دو عددی سطح پر بلند غذائی افراط زر کی موجودگی پاکستان میں غریبوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی ہے اور غذا میں اس سطح کا افراط زر ہی وہ متوقع سبب ہے جس کے باعث گزشتہ تین برسوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ غربت کی لکیر سے نیچے آ گئے ہیں۔ پاکستان کو اگلے تین برسوں کے لیے گندم کی امدادی قیمت کو اس کی موجودہ سطح تک محدود کر دینا چاہیے۔ جہاں تک تیل کا تعلق ہے تو پاکستان کو پٹرولیم

مصنوعات پر ٹیکس پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہئے کیونکہ اس مسئلے پر سب سے زیادہ ٹیکس لگایا جاتا ہے جس کی وجہ سے پٹرولیم مصنوعات کی ڈومیسٹک قیمتیں متوسط طبقے کی پہنچ سے باہر ہو گئی ہیں۔

خوراک کے بحران پر قابو پانا ہو گا

روزنامہ آواز 1280 اکتوبر 2009ء، ص 4

دنیا بھر میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ہر سال خوراک کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی 16 اکتوبر کو یہ دن منایا گیا۔ اس بار عالمی یوم خوراک بحران کے زمانے میں خوراک کی سلامتی کا حصول کے نعرے کے تحت منایا گیا۔ دوسری جانب دیہی خواتین کا عالمی دن منانے کا مقصد زراعت درپہات کی ترقی میں خواتین کے کردار و کارکردگی کا دل کھول کر اعتراف کرنا ہے۔ دنیا میں دیہی خواتین کا پہلا عالمی گزشتہ برس پندرہ اکتوبر کو منایا گیا تھا۔ دیہی خواتین کا خصوصی دن منا کر انھیں عزت و احترام دینے کا آئیڈیاسب سے پہلے 1995ء کو بیجنگ (چین) میں منعقدہ چوتھی عالمی کانفرنس برائے خواتین میں پیش کیا گیا تھا جس کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ عالمی یوم خوراک کے تحت پندرہ اکتوبر کو عالمی یوم دیہی خواتین کے طور پر منایا جائے گا تاکہ خوراک کی پیداوار اور خوراک کی سلامتی کے لیے دیہی خواتین کے کردار کو اجاگر کیا جائے جو نا صرف اپنے گھر کو سنبھالا دیتی ہیں بلکہ بیج بینکوں کے قیام اور کھیت کھلیان اور دھقان کی دیکھ بھال میں مثالی کردار ادا کر کے خوراک کی خود مختاری کو بھی یقینی بناتی ہیں۔ گندم کی بوائی ہو یا گہائی خواتین کا کردار روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ چاول کی پنیری لگاتی پاکستانی خواتین آپ نے ہمیشہ متحرک دیکھی ہوں گی اگرچہ کپاس نقد آور فصل ہے اور غربت کے خاتمے کے حوالے سے کردار ادا کر سکتی ہے اور پاکستانی معیشت میں کرتی ہے مگر غذائی خوراک کے ضمن میں نہیں آتی لیکن کپاس کی چنائی میں پاکستان خواتین مردوں سے کئی قدم آگے ہیں۔

ماہرین کے مطابق اس دفعہ عالمی یوم خوراک کو بحرانوں کے زمانے میں کو راک کی سلامتی کے حصول کے طور پر منانے کا مقصد عالمی اقتصادی بحران کے تناظر میں دنیا کو یہ احساس دلانا ہے کہ ہر شخص دفاتر اور کارخانوں میں کام نہیں کرتا بلکہ دنیا کے چھوٹے کسانوں اور دیہی علاقوں کو بحران کا سامنا ہے جہاں دینر کے ستر فیصد بھوکے رہتے اور کام کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 2009ء میں ایک سو پانچ ملین بھوکے افراد کا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جبکہ ایک اعزاز یہ صفر پانچ بلین لوگ غذائیت کی کمی کا شکار ہیں۔ اس لیے عالمی ادارہ خوراک کی سلامتی پر عالمی سربراہی کے انعقاد کا مقصد بھوک کے خاتمے کے لیے بنیاد میں فراہم کرنا ہے۔

خوراک انسان کا بنیادی حق ہے مگر اسے انسان کی محرومی کو سامراجی طاقتیں بطور سیاسی ہتھیار اور ضمیر فروش ذخیرہ اندوز حکمران اشرافیہ استحصالی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ سوویت یونین کے خلاف امریکہ غذائی بم کا استعمال کامیابی سے کر چکا ہے۔ پاکستان کے ازلی دشمن بھارت نے اس بات کا ادراک کرنے کے بعد کہ ایٹمی پاکستان کے ساتھ روایتی یا غیر روایتی جنگ اب لڑی اور جیتی نہیں جاسکتی ایک طے شدہ منصوبے کے تحت پاکستان کے خلاف آبی جارحیت شروع کر رکھی ہے جس کے تحت بگلیہار ڈیم کشن گنگا ڈیم سمیت پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں پر 12 ڈیموں کی تعمیر کے ذریعے پاکستان کو بنجر بنانے کی کاروائیاں جاری ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان کی خوراک کی خود مختاری اور خوراک کی سلامتی مکمل طور پر خطرے میں پڑ جائے گی۔

بھارتی آبی جارحیت کا احساس و ادراک پاکستان کی خواتین کسانوں کو بہت اچھی طرح ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے 6 ستمبر کو واہگہ بارڈر پر بھارتی آبی جارحیت کے خلاف بھرپور مظاہرہ کر کے کیا۔ اس مظاہرے میں مرد کسانوں نے بھی پاکستان متحدہ کسان محاذ کے زیر اہتمام بھرپور انداز میں

شرکت کی تھی۔ کہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں جنگیں پانی پر ہوں گی۔ پاکستان کے خلاف بھارت نے آبی جنگ شروع کر رکھی ہے اور پاکستان کی کسان خواتین اور مردوں نے بھارتی آبی جارحیت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے کیونکہ بھارتی آبی جارحیت کے نتیجے میں دریائے چناب جس میں اپریل مئی میں پانی کا بہاؤ 34 ہزار کیوسک ہونا چاہئے وہ کم ہو کر 17 ہزار کیوسک رہ گیا ہے۔ اسی طرح کشن گنگا ڈیم کی تعمیر سے بھارت ناصرف پاکستان کے حصے کا پانی چوری کر کے ذخیرہ کر رہا ہے بلکہ دریائے جہلم کا رخ بھی تبدیل کر رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں مظفر آباد کے مقام پر اب دریائے جہلم اور نیلم کا ملاپ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بھارتی پانی چوری کے نتیجے میں دریائے جہلم نالے کی شکل اختیار کر تا جا رہا ہے۔ اسی طرح دریائے کارگل پر بھی بھارت ڈیم بنا رہا ہے۔ بھارت دریاؤں کو لنک کرنے کے ایک منصوبے پر بھی کام کر رہا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان ہی نہیں بنگلہ دیش سمیت پڑوسی ممالک کا پانی چوری کر لے گا۔ پانی انسانوں اور زراعت کے لیے زندگی ہے جس کی کمی دونوں کو مردہ کر دیتی ہے۔ تاہم اس کا احساس پاکستانی کسانوں کو زیادہ اور حکومت کو رسمی حد تک ہے کیونکہ پاکستان کے انڈس واٹر کمشنر جماعت علی شاہ نے کشن گنگا ڈیم کے ڈیزائن سے متعلق بھارت کو خط لکھا ہے مگر تاحال جواب نہیں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ سندھ طاس معاہدے کے تحت بھارت پانی ذخیرہ کر سکتا ہے دریا کا رخ تبدیل نہیں کر سکتا۔ پاکستان کے اعتراضات میں سب سے اہم نکتہ پانی کے رخ کی تبدیلی ہے۔ جھگڑا یہ ہے کہ بھارت مقبوضہ کشمیر میں دریائے جہلم پر 330 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا ایک منصوبہ شروع کر چکا ہے۔ یہ ڈیم مظفر آباد سے 160 کلومیٹر اوپر کی طرف واقع ہے۔ اس ڈیم کے بننے سے کشن گنگا دریا (جسے پاکستان میں دریائے نیلم کہا جاتا ہے) کا پانی

ایک اور نالے میں جا گرے گا۔ نتیجتاً دریائے نیلم کا پانی کم ہو جائے گا جس کا نقصان پاکستان کو بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت میں کمی کی صورت میں برداشت کرنا پڑے گا۔ پاکستان کا موقف ہے کہ یہ منصوبہ معاہدہ سندھ طاس کی خلاف ورزی ہے۔ 2004ء میں پاکستان کے لاتعداد اعتراضات کی وجہ سے بھارت نے ڈیم کے ڈیزائن میں چند تبدیلیاں کیں لیکن پاکستان کے بنیادی اعتراضات دور نہیں کیے۔ بھارت کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ نیلم جہلم منصوبہ بعد میں تشکیل دیا گیا تھا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کون سا منصوبہ پہلے شروع کیا گیا اور کون سا بعد میں، اصل سوال یہ ہے کہ کیا کیشن گنگا ڈیم کا بننا معاہدہ سندھ طاس کی خلاف ورزی ہے یا نہیں؟

معاہدہ سندھ طاس کے مطابق بھارت میں جتنا پانی ذخیرہ کیا جائے گا اتنا ہی پانی چھوڑنا بھی پڑے گا۔ پانی کے رخ کی تبدیلی کی وجہ سے پاکستان کو گرمیوں میں 11 فیصد اور سردیوں میں 27 فیصد پانی سے محروم ہونا پڑے گا۔ پاکستان میں ایکو سسٹم بری طرح متاثر ہونے کی وجہ سے فصلوں اور ماحولیات کا جو نقصان ہو گا وہ ناقابل تلافی ہے۔ دوسری طرف بھارت پاکستان کی طرف سے اٹھائے گئے ان اعتراضات کو نہیں مانتا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ پانی کا رخ تبدیل کرنے سے پاکستان کا پانی کم نہیں ہو گا بلکہ اتنا ہی رہے گا فرق صرف یہ پڑے گا کہ پہلے نیلم اور جہلم دریا آزاد کشمیر میں آکر ملتے تھے لیکن اب مقبوضہ کشمیر میں ہی مل جائیں گے۔ ابھی تک جماعت علی شاہ کی کارکردگی قلمی دوستی اور تاخیری خط و کتابت تک محدود ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کی خوراک کی سلامتی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے بھارتی آبی جارحیت کا مسئلہ وزارت خارجہ کی سطح پر اٹھایا جائے اور اس مقصد کے لیے بھرپور محنت اور

مکمل ہوم ورک کر کے عالمی بینک اور عالمی عدالت انصاف میں جا کر صرف کیس لڑا نہ جائے بلکہ جیتا بھی جائے۔

عالمی یوم خوراک کے موقع پر ہی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انقلاب روس سے پہلے چھوٹے کسانوں کے ہزاروں قافلے خوراک کی تلاش میں غول در غول مارے مارے پھرتے تھے مگر ماسکو کی روشنیاں اور رنگینیاں ماند نہیں پڑیں تھیں نہ ظالم زادوں کو بھوکے انسانوں کے تڑپ تڑپ مارنے کا کوئی احساس یا غم تھا جس کے بعد دنیا نے انقلاب روس اور ظالموں کے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ بھوکے ننگے عوام جب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو انقلاب ضرور آتا ہے۔

بالکل اسی طرح پاکستان میں استحصالی رویے کی نتیجے میں لوگ سستے آٹے کے لیے ہاتھوں میں رقم لیے پولیس کے لاٹھی چارج یا پھر بد انتظامی، بھگدڑ مچ جانے اور گرمی کی شدت کے نتیجے میں موت کے منہ میں چلے گئے مگر ذخیرہ اندوزوں کو احساس تک نہ ہوا کہ یہ انسانوں کی موت ہے لیکن اگر آٹے اور دوسری غذائی اجناس کی عدم دستیابی اور قحط پڑ گیا تو آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں مگر پاکستان میں خوراک کی خود مختاری اور سلامتی کو یقینی بنانے والے کسان خود عدم تحفظ کا شکار ہو جائیں گے۔ گندم کی فصل تیار ہوتی ہے تو چھوٹے کسان کو بار دانہ نہیں ملتا۔ اب دھان کی فصل تیار ہے مگر قیمت کا بحران اور کسان پریشان آخر کیوں اور کب تک؟ کھلے آسمان تلے گندم کے بعد بطور غذا سب سے زیادہ اہمیت والی دھان کی فصل پڑی ہوئی ہے مگر پاسکو ابھی تک بروقت اقدامات کے حوالے سے کوئی قابل فخر کردار ادا نہیں کر سکا بلکہ اس ادارے کے سربراہ تو مسائل کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر دھان کے کسانوں کو ایک بار پھر نجی شعبے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو ماضی کی طرح کیا وہ باسستی چاول جیسی پاکستان کی بہترین قسم کو ریڑھیوں پر رکھ کر مقامی مارکیٹ میں فروخت کریں

گے؟ حالانکہ پاکستانی باسیتی کی دنیا میں مانگ اور جواب نہیں۔ پاکستان کا ازلی دشمن بھارت پاکستانی باسیتی اپنے برانڈ نام سے فروخت کرنے سے بھی باز نہیں آتا مگر ستم بالائے ستم کہ حکومت کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے باسیتی کے کسان اور فصل دونوں رل رہے ہیں حالانکہ خوراک کے حوالے سے چاول گندم کے بعد دوسرے نمبر پر پاکستان میں زیر استعمال ہے۔

باب ششم پانی کا بحران

آئندہ جنگِ پانی کے مسئلے پر ہوگی پاکستانی بنگلہ دیشی عوام اس کے لیے تیار ہیں؟

خالد بیگ، روزنامہ نوائے وقت مامتان، 25 مئی 2008

اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارے UNDP نے خبردار کیا ہے کہ پانی کی کمی کا مسئلہ مستقبل میں تنازع اور بعض علاقوں میں اس سے بھی آگے بڑھ کر جنگ کی شکل اختیار کر سکتا ہے کیونکہ دنیا میں 200 دریا ایسے ہیں جو کہ دو یا دو سے زیادہ ممالک کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ و افریقہ و اتر یسور سز کنسور شیم نے پانی کی کمی پر اپنی تحقیقاتی رپورٹ جاری کی ہے کہ عرب اسرائیل اختلافات اور عراقی جنگ (امریکہ کی طرف سے مسلط کردہ) کے باعث اس خطے کے ممالک خصوصاً عرب، پانی کے مسئلے کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ اسی رپورٹ میں 1985ء میں اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری بطروس غالی کے بیان کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس میں انھوں نے مصر کو انتباہ کیا تھا کہ اس کی سلامتی آٹھ افریقی ممالک کے رحم و کرم پر ہے جہاں سے دریائے نیل گزر کر مصر کو سیراب کرتا ہے۔ بطروس غالی نے بھارت کو بھی تلقین کی تھی کہ وہ اپنے چھوٹے ہمسایوں پاکستان اور بنگلہ دیش کے ساتھ پانی کے تنازعات کو پرامن طور پر حل کرنے کی کوشش کرے۔ گزشتہ چند ماہ سے پاکستان میں ارسا کے منتظمین بار بار عوام کو آگاہ کر رہے ہیں کہ بھارت دریائے سندھ اور دیگر آبی گزرگاہوں پر 52 کے قریب ڈیم بنانے کی منصوبہ بندی کر چکا ہے جن میں سے کچھ پر کام کا آغاز کر دیا گیا اور سب سے خطرناک کارگل کے پہاڑوں میں سرنگ بنا کر اس کے ذریعے دریائے سندھ کا رخ موڑنے کا منصوبہ ہے (جس کے بعد نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی بانسری) ارسا والوں کی التجاہر بار پاکستان کے دیگر داخلی سیاسی مسائل میں اس طرح دب کر رہ جاتی ہے جیسے نقاروں میں طوطی کی آواز۔ پانی کی کمی کے خطرے سے آگاہ کرنے والوں کے پاس نہ تو الہ دین کا

چراغ ہے جسے رگڑیں اور جن کو حکم دیں کہ وہ جا کر دشمن کے منصوبے خاک میں ملا دے اور نہ ہی سیاسی لیڈران اور وکلاء برادری کی طرح الیکٹرانک میڈیا والوں کی نظر میں ان کی اہمیت جس کے ذریعے عوام کو آنے والے مشکل حالات یا خطرات سے آگاہ کیا جاسکے۔

اس مسئلے سے اکیلا پاکستان ہی دوچار نہیں ہے۔ ہم سے کٹ کر جدا ہونے والا بازو بنگلہ دیش بھی اسی مشکل سے دوچار ہے۔ بھارت خلیج بنگال کے مسلمانوں کو پیاسا مارنے کا پکا ارادہ کر چکا ہے۔ بنگلہ دیش کا معروف دانشور عبدالرحمن خان بھی کم و بیش یہی رونا رو رہا ہے کہ بھارت نے دریائے گنگا کا پانی مستقل طور پر روک کر بنگلہ دیش کو بخر بنانے کے منصوبے کا آغاز کر دیا ہے۔ 28 مارچ 2008ء کو واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والے "

Bangladesh Drying as India withdrawing Ganges Water" کے عنوان سے اپنے کالم میں عبدالرحمن نے پوری دنیا سے گلہ کیا ہے کہ بھارت کے ساتھ تنازعات کے حل کے لیے کوئی بھی ملک بنگلہ دیش کی مدد کرنے کو تیار نہیں تو اور بھارت از خود ڈھونڈے گئے منصوبوں سے (جو شیخ مجیب الرحمن کے دور میں کیے گئے تھے) بھی پوری طرح منکر ہو چکا ہے۔ جن میں دریائے گنگا کے پانی کی تقسیم کا معاہدہ سرفہرست تھا۔ اس پر عملدرآمد کے لیے مجیب الرحمن نے بہت سے سرحدی اضلاع (بنگلہ دیشی عوام کی مرضی کے بغیر) بھارت کے حوالے کر دیے جن کے بدلے بھارت نے اپنی پارلیمنٹ میں وعدہ کیا کہ وہ فرکا بیراج کے ذریعے گنگا کے پانی کو روکنے کے لیے مزید نہریں نہیں بنائے گا لیکن بھارت اپنے ہی تحریری معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گزشتہ 34 برسوں میں مزید 5 نہریں نکال چکا ہے۔ بنگلہ دیشی عوام اس پر بھی سراپا احتجاج بنے رہے، معاملہ عالمی بینک و اقوام متحدہ کے سامنے بھی اٹھایا گیا لیکن کہیں سے شنوائی نہیں ملی مگر اب

پانی سرسے گزرنے والا ہے کیونکہ بھارت اپنی کلکتہ کی بندرگاہ کو بچھانے کے لیے دریاہوگی میں پانی کا بہاؤ سارا سال یکساں رکھنا چاہتا ہے جس کے لیے دریائے گنگا کا رخ موڑ کر اسے ہوگلی میں ڈالنا ضروری ہے۔

واپس آتے ہیں پاکستان کو درپیش پانی کی کمی جیسے خطرات کی طرف سوال یہ ہے کہ کیا واقعی پاکستان کے لیے مستقبل میں پانی کی کمی کا حقیقی خطرہ موجود ہے یا سب پروپیگنڈہ ہے۔ اگر خطرہ ہے تو وہ کون سے عوامل یا خفیہ چہرے ہیں جو بتدریج پاکستان کو اندھیروں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ کالا باغ ڈیم کو پاکستان کی یکجہتی کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں؟

جواب ملاحظہ کیجئے: یہ جنوری 2001ء کی بات ہے، انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز کے سالانہ کنونشن کا چالیسواں افتتاحی اجلاس جاری تھا۔ مختلف مقررین کے بعد جب خطبہ صدارت کیک لیے اسے کیو خان ریسرچ لیبارٹری کے سربراہ اور ممتاز قومی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان مائیک کے سامنے تشریف لائے تو انھوں نے آتے ہی کالا باغ ڈیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور مستقبل میں اس کی اہمیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے شدید دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں پانی کی قلت ہے لیکن ہم بے دردی سے قیمتی پانی ضائع کئے جا رہے ہیں۔ موسم گرما میں جب پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور بے تحاشا بارشیں ہوتی ہیں تو ہمارے دریاؤں میں سیلاب آجاتا ہے اور آبی ذخائر نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر پانی سمندر برد ہو جاتا ہے لیکن رنج کی فصلوں کے موقع پر پانی دستیاب نہیں ہوتا۔ نہری گرد بندی کرنی پڑتی ہے۔ صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم پر جھگڑے ہوتے ہیں پھر بھی کالا باغ ڈیم جیسے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ اسے متنازع بنانے والے قومی مجرم ہیں۔ حالانکہ کالا باغ ڈیم جیسے قومی مفاد کے منصوبے کو تکنیکی زاویوں

سے دیکھا یا مسترد کیا جانا چاہئے تھا لیکن اسے محدود مقامی مفادات یا سیاسی تعصب کی عینک سے دیکھا جانے لگا ہے۔ جبکہ عالمی مبصرین بھی کہہ رہے ہیں کہ تیسری عالمی جنگ کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ ملکوں کے درمیان پانی کی تقسیم کے جھگڑوں پر ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا کہ اگر ہم پانی ضائع ہونے سے بچالیں تو صرف پانچ سال کے عرصہ میں پاکستان ترقی کر کے جدید ترین ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے لیکن پاکستان کے دشمن ایسا نہیں چاہتے۔ اگر ہمیں ڈاکٹر قدیر خان جیسے عظیم انسان کی بات پر بھی اعتبار نہیں تو مطالعہ کیجئے بھارتی مصنف ڈاکٹر بھٹا چاریہ کی بھارت کے آبی منصوبوں سے متعلق کتاب Water Power Engineering یہ کتاب جنوری 1990ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی تو کانگریس جماعت نے اسے ضبط کرنے کا حکم دے دیا کیونکہ اس کتاب میں بھارتی حکومت کے ان آبی منصوبوں کے بارے میں انکشاف کیا گیا تھا جن کی تکمیل کے بعد بھارت جب چاہے پانی روک کر پاکستانی زراعت کو تباہ کر سکے گا اور ضرورت پڑنے پر آبی ذخائر سے وافر پانی چھوڑ کر پاکستان کے میدانی علاقوں میں سیلاب کی کیفیت پیدا کی جاسکے گی۔ اس منصوبے کا نام (جو کہ اس دور میں صرف کانغذوں تک محدود تھا) "Garland Canal System" تجویز کیا گیا تھا۔

برسر اقتدار حکومتی جماعت کا موقف تھا کہ چونکہ منصوبہ ابھی ڈرائنگ و فائلوں تک محدود ہے، یہ عوام کے سامنے آگیا تو اس پر عملدرآمد مشکل ہو جائے گا اور یہی ہوا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو کتاب کے ذریعے جب منصوبے کے بارے میں آگاہی ہوئی تو اس نے مخالفت شروع کر دی کیونکہ پاکستان و بنگلہ دیش کو جانے والی آبی گزرگاہوں کا رخ موڑ کر جن علاقوں میں پانی کے بڑے ذخائر تعمیر کرنے کی نشاندہی کی گئی تھی وہ سب بی جے پی کے سیاسی گڑھ تھے۔ ہندوؤں کی انتہا پسند تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ کے ساتھ مذاکرات میں انھیں کانگریس جماعت نے سمجھایا کہ مقصد اس

منصوبے کا پاکستان و بنگلہ دیش پر دسترس حاصل کرنا ہے۔ بی جے پی کو سیاسی نقصان پہنچاتا نہیں تو انھوں نے منصوبے کی مخالفت ختم کر دی لیکن اس کے لیے انتہا پسند ہندو حکومت سے بے شمار رعایتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے (ان کامیاب مذاکرات کے بعد ہی ایل کے ایڈوانی کی قیادت میں رتھ یاترا کو بابر میسج کو شہید کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور سیاست چمکانے کے لیے بی جے پی کو کھلی چھوٹ مل گئی)۔ کتاب میں دیے گئے آبی منصوبے کو اگر کم سے کم الفاظ میں لکھا جائے تو اس کا مطلب یہی بنتا ہے کہ دریا کو نکلنے کے مقام سے لے کر اس کا سارا سفر آخری منزل تک اس طرح کنٹرول کیا جائے کہ پانی کو سستی بجلی کی پیداوار و زرعی استعمال سے لے کر ضرورت کے وقت دشمن کے خلاف مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ یوں بھارت کو ہمسایہ ممالک پاکستان و بنگلہ دیش پر تحکمانہ فوقیت بھی (بغیر جنگ لڑے) حاصل ہو جائے گی۔

منصوبے میں مغربی دریائے راوی سے لے کر مشرق میں دریا برہم پتر تک 3800 کلومیٹر طویل نہر اور راستے میں 30 بڑے اور 350 چھوٹے آبی ذخائر کی تعمیر شامل ہے۔ ہمالیائی چوٹیوں سے رواں دیگر آبی گزرگاہوں کو بھی نہروں، آبی سرنگوں کے ذریعے مرکزی نہر کے ساتھ ملا دیا جائے گا جس کے بعد ہمالیہ کا پانی بلا شرکت غیرے بھارت کے قبضے و تصرف میں ہو گا۔ کتاب میں نہروں کی لمبائی، چوڑائی و گہرائی سے لے کر ان کی پورے بھارت میں روٹ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

1990ء سے لے کر آج تک بھارت اپنے بھی اتک آبی منصوبے کو کس حد تک مکمل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کا علم تو ہماری وزارت خارجہ کو ہو گا لیکن گزشتہ برس بھارت و اسرائیل کے مابین واٹر مینجمنٹ کے تین سالہ پراجیکٹ میں تعاون کو معاہدے کی شکل حاصل ہونے کے بعد ہی خبریں آنا شروع ہوئی ہیں کہ بھارتی حکومت دریائے سندھ کا رخ موڑنے کے لیے کام کا آغاز کر چکی ہے اور دریائے گنگا کو فرکابیر ارج کے مقام پر بند کرنا چاہتی ہے۔

بھارتی وزارت خارجہ کا وفد حال ہی میں اپنا دورہ مکمل کر کے پاکستان سے واپس گیا ہے۔ عالمی مبصرین حیران ہے کہ اس دورے میں پانی کے مسئلے پر بھارتی وزیر خارجہ و سیکرٹری خارجہ سے پاکستانی صحافیوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں یا پھر وہ اتنے اہم مسئلے سے پوری طرح آگاہ ہی نہیں ہیں۔ صورت حال جو بھی ہے دونوں ہمسایہ ممالک کے باہمی تعلقات بظاہر جس قدر خوشگوار ہوں آخر کار اپنی بقا کے لیے پاکستان کا بھارت کے ساتھ ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ بنگلہ دیش تو ٹھیک ہے کمزور ملک ہے بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن پاکستان تو ایٹمی قوت ہے اس کے باوجود اگر بھارت ہمارا پانی روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں ذلیل و رسوا ہونے سے قبل ہی برہمن کی اطاعت قبول کر لینا چاہئے۔

آخر میں قارئین کی دلچسپی کے لیے بنگلہ دیش و بھارت کے درمیان گنگا کے پانی کا تنازع اور اس کا پس منظر (مختصر) تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ بنگلہ دیش سے پاکستان کا تعلق نام کی شناخت سے مشروط نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر وہ 1971ء میں عالمی سازش کے تحت ہم سے الگ ہو گیا۔ آخر آج بھی ہمارا دشمن تو ایک ہے اور اس کا ہدف دو قومی نظریہ بھی اور نہ ہی ہم انکار کر سکتے ہیں کہ فرکا بیراج کا تنازع بنگلہ دیشی عوام کو ہماری طرف سے ورثے میں ملا۔

دریائے گنگا کے پانی کی تقسیم پر پاکستان و بھارت کے درمیان تنازع کا آغاز 1951ء میں ہو گیا تھا جب اس نے پاکستانی سرحد سے صرف 17 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک کلومیٹر طویل فرکا بیراج تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کے لیے علاقے کا سروے شروع کیا۔ پاکستانی احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بھارت نے 1962ء میں تعمیر کا آغاز کر دیا۔ پاکستان 1968ء میں معاملہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں لے گیا جہاں اس پر ہمدردانہ (مکارانہ) غور کا سلسلہ جاری تھا کہ اس دوران پاکستان

دولت ہو گیا۔ مشرقی پاکستان بن گیا بنگلہ دیش اور وہاں بھارت کی کھپتی حکومت شیخ مجیب الرحمن کی قیادت میں برسرِ اقتدار آگئی۔ مجیب الرحمن نے اپنی عوام کی اٹک جوتی کے لیے بھارت کو مجبور کر کے دونوں ملکوں کا Joint River Commission بنانے پر رضامند کر لیا۔ اس دوران دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت بھی جاری رہی (جیسا کہ آج کل پاکستان کے ساتھ جاری ہے) اور فرکا بیراج کی تعمیر بھی۔ آخر کار 1975ء میں فرکا بیراج مکمل ہو گیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت نے اس بیراج کو ہندو قوم کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا۔ بھارت میں بیراج کی تعمیر پر جشن منانے کا سلسلہ جاری تھا کہ کرنل فاروق اور اس کے ساتھیوں نے مجیب الرحمن کو اس کے خاندان سمیت ٹھکانے لگا دیا (قتل کی وجوہات میں فرکا بیراج کی تعمیر پر مجیب الرحمن کی مجرمانہ خاموشی بھی ایک سبب تھی)۔ مجیب الرحمن کے قتل کے بعد بنگلہ دیش اقوام متحدہ میں موجود پاکستان کے زمانے کی فرکا بیراج کے خلاف قرارداد کو دوبارہ بحال کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ پاکستان چین و دیگر اسلامی ممالک کے دباؤ پر 1978ء میں اقوام متحدہ میں بھارت نے تسلیم کیا کہ گنگا بین الاقوامی دریا ہے (سوویت یونین کے خلاف پاکستانی حمایت حاصل کرنے کے لیے امریکہ نے بھی بنگلہ دیش کی حمایت کی) اور دریا کے پچاس فیصد پانی پر بنگلہ دیش کے قانونی حق کو تسلیم کر لیا۔ لیکن چونکہ بھارت بین الاقوامی قوانین، سفارتی آداب اور سرحدی جواہر سمیت دنیا کے تمام اصولوں کا مذاق اڑانے، ان کی سرعام دھجیاں بکھیرنے کا عادی ہے اس لیے 1982ء میں بھارت نے (اقوام متحدہ میں پانی کی تقسیم کے فارمولے کو تسلیم کرنے کے باوجود) خشک سالی کا موسم آتے ہی گنگا کا پانی روک کر اسے دریا ہو گلی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سارک کا فورم تشکیل پا چکا تھا۔ بنگلہ دیش نے یہاں بھی احتجاج کی صدا بلند کی۔ جواہر بھارت نے ہر طرح کے تنازعات کے حل کے لیے بات چیت کے عمل کو جاری رکھنے پر زور دیا اور اندر خانے اپنے ناپاک

عزائم کی تکمیل کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس کامیاب حکمت عملی نے بھی بھارت کو حوصلہ دیا ہے کہ وہ اب بنگلہ دیش کو ہمیشہ کے لیے گنگا کے پانی سے محروم کر دے۔ اس کے لیے بھارت نے ایک اور چال چلی ہے۔ گنا کو اپنے مذہب کا اہم جزو قرار دے کر جنوبی پورے بھارت میں مہم چلا رہے ہیں کہ گنگا جل پر مسلمان بنگلہ دیش کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ وہ ایک بوند بھی بنگلہ دیش میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ بھارت کی جمہوری حکومت اپنے کروڑوں عوام کا اجتماعی مطالبہ کسی طرح رد کر سکتی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نائو کالا باغ کی تعمیر پر متفق ہو سکتے ہیں اور ہمارے دریاؤں کا پانی روکا جا رہا ہے۔ اس کی بھی ہمیں پرواہ نہیں ہے۔

بارشیں، سیلاب قدرت کا تحفہ

بارشیں اور دریاؤں میں پانی کی فراوانی خدا کی نعمت ہے۔ سیلاب سے پراپرٹی کا نقصان افسوس ناک لیکن اہم چیز ہے۔ انسانی زندگی کی بقا زیادہ اہم ہے جس کا انحصار پانی کی وافر دستیابی پر ہے۔ ہمارا ملک جغرافیائی طور پر خشک (صحرائی) اور نیم صحرائی خطوں پر مشتمل ہے۔ ہماری تہذیب دریائی پانی سے سیراب ہونے والی زراعت پر مبنی ہے اس لیے یہاں معمول سے زیادہ پانی آنا رحمت کا باعث ہے۔ اس سے زیر زمین پانی میں اضافہ ہو گا۔ دریاؤں کی طغیانی ہمالیائی پہاڑوں کی معدنیات سے مالا مال مٹی اپنے ساتھ لائی ہے جس سے ہمارے میدانی علاقوں کی زرخیزی بڑھے گی۔ اگر ہم عقل مندی اور دوراندیشی کا مظاہرہ کریں تو اس کثیر پانی سے مزید فائدے اٹھا سکتے ہیں۔ مفت ملنے والے

اربوں ڈالر مالیت کے اس پانی کو محفوظ کر کے خشک سالی کے دنوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔ دریاؤں کی طغیانی سے جو علاقے متاثر ہوئے ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے کپے یا بیٹ کے علاقوں میں اپنے مکانات اور ڈیرے بنالیے ہیں۔ بیٹ دریا کے زیادہ سے زیادہ پاٹ یا چوڑائی کا علاقہ ہوتا ہے۔ برطانوی دور میں قانون تھا کہ اس دریائی علاقہ میں کوئی مستقل تعمیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ اب یہ قانون عملاً ختم ہو چکا ہے۔ جب دریا کے پاٹ میں لگ رہنے لگیں گے اور ندی نالوں کے راستوں میں مکان اور کارخانے بنائیں گے تو سیلاب کے دنوں میں ان کا جانی اور مالی نقصان تو ہو گا۔ کروڑوں لوگ ان علاقوں میں مقیم ہو چکے ہیں۔ ان کو یہاں سے نکالنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورت حال کا ایک حل یہ ہے کہ جو علاقے عام طور سے سیلاب کی زد میں آتے ہیں وہاں لوگوں کو کچھ اونچائی پر کی تعمیرات کرنے کے لیے مالی امداد یا آسان قرضے دیے جائیں تاکہ وہ کم سے کم جانی نقصان کا شکار ہوں۔ تباہی پھیلنے کے بعد بھی تو حکومت اربوں روپے بحالی کے کاموں پر خرچ کرتی ہے۔ یہی رقم پیشگی حفاظتی اقدامات پر لگادی جائے تو زیادہ بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

روایتی طور پر پاکستان میں چار سال پانی کی بہتات (wet years) کے ہوتے ہیں اور اگلے چار برس خشک سالی کے ہوتے ہیں جن میں بارشیں کم ہوتی ہیں اور دریاؤں میں پانی کم آتا ہے۔ مثلاً 92-1991ء میں بڑا سیلاب آیا تو ہمارے دریاؤں میں کل پانی کی سالانہ مقدار 27 ملین ایکڑ فٹ تک جا پہنچی۔ اس کے برعکس 2001-2002ء میں خشک سالی تھی اور پانی کی مقدار محض 91 ملین ایکڑ فٹ تھی۔ ایک ملین ایکڑ فٹ پانی کی وہ مقدار ہوتی ہے جو دس لاکھ ایکڑ رقبہ پر ایک فٹ اونچا کھڑا ہو جائے۔ ہماری آبپاشی کی کل سالانہ ضرورت سے زیادہ سے زیادہ 114 ملین ایکڑ فٹ پانی ہے۔ سالانہ پانچ چھ ملین ایکڑ فٹ پانی کو ٹری سے نیچے سمندر میں ڈالنے کے لیے درکار ہوتا ہے تاکہ سمندر زمین کی طرف اندر نہ بڑھے۔ اس کے بعد جو بھی پانی بچتا ہے اسے کسی ذخیرہ یا ڈیم میں محفوظ

کر کے ہم خشک سالی کے دنوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم جیسے زرعی ملک کے لیے پانی کی موجودہ بہتات قدرت کا تحفہ ہے۔ پانی کی قلت کے برسوں میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب سندھ اور پنجاب محض دو تین ملین ایکڑ فٹ پانی کی خاطر جھگڑنے لگتے ہیں اور قومی یکجہتی خواب نظر آنے لگتی ہے۔ پانی کی موجودہ بہتات کا دورانیہ 2010ء میں شروع ہوا تھا۔ ماضی کے پیٹرن کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ اگلے سال سے خشک سالی کا دورانیہ شروع ہو سکتا ہے۔ پھر ہمارے سوکھے دریا ہمیں پانی کی اہمیت یاد دلائیں گے۔ اگر ہم نے اس سیزن میں آنے والا زیادہ پانی محفوظ کر لیا ہوتا تو اگلے برسوں میں خشک سالی کی سختیوں سے بچ سکتے تھے۔ موجودہ مون سون میں خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں جو زبردست بارشیں ہوئی ہیں اس کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ زیر زمین پانی ری چارج ہو گیا ہے۔ زمین کے نیچے واٹر ٹیبل قدرے اونچا ہو گیا ہے۔ یہ پانی ہمارے پینے کے استعمال کا بڑا ذریعہ ہے اور کاشتکاری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ دیہات اور قصبوں میں زیادہ تر لوگ ہاتھ کے نلکوں اور مشینوں کے ذریعے پانی کھینچ کر گھریلو ضروریات پوری کرتے ہیں۔ شہروں میں ٹیوب ویلوں کے ذریعے اس پانی کو کھینچ کر پائپوں کے ذریعے گھروں میں پہنچایا جاتا ہے۔ چونکہ آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور جدید طرز زندگی کی وجہ سے پانی کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے اس لیے زیر زمین پانی کی مقدار کم ہوتی جا رہی ہے۔ لاہور میں کچھ عرصہ پہلے میں فٹ گہرائی سے پانی نکل آتا تھا۔ اب ایک سو فٹ سے زیادہ کھدائی پر پانی نکلتا ہے۔ اگر بارشوں اور سیلاب کے ذریعے زمین میں پانی جذب نہ ہو تو لاہور سمیت تمام بڑے شہروں میں پانی کی قلت بحرانی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس بار مون سون کے باعث پانی کی اتنی فراوانی ہے کہ تمام دریاؤں میں اونچا سیلاب ہے۔ حتیٰ کہ راوی اور ستلج میں بھی طغیانی ہے حالانکہ ان کا پانی سندھ طاس معاہدہ کے مطابق بھارت کو دیا جا چکا ہے۔

دریائے جہلم میں عام طور سے اس موسم میں ایک سے ڈیڑھ لاکھ کیوسک پانی آتا ہے لیکن اس دفعہ چار لاکھ کیوسک پانی آگیا۔ کچھ برس پہلے منگلا ڈیم کی توسیع کر کے اس کی استعداد بڑھادی گئی تھی۔ یا اضافی پانی اس ڈیم میں جمع ہو گیا جسے ہم موسم سرما میں استعمال کر سکیں گے۔ جب دریا تقریباً خشک ہو جاتے ہیں۔ 1992ء میں دریائے جہلم میں سیلاب آیا تھا تو منگلا ڈیم کی استعداد کم تھی اس لیے سیلابی پانی نے جہلم شہر کو غرق کر دیا تھا اور چناب کے ساتھ مل کر پورے پنجاب میں تباہی پھیلادی تھی۔ اس بار ایسا نہیں ہوا۔

دریائے چناب میں اس بار معمول سے دگنا پانی آیا ہے۔ یہ دریا میدانی علاقہ میں پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر ڈیم نہیں بنایا جاسکتا۔ پاکستان صرف دریائے سندھ پر مزید ڈیم بنا کر اضافی پانی کو محفوظ کر سکتا ہے۔ آب پاشی کے لیے بھی اور انتہائی سستی بجلی بنانے کے لیے بھی دریائے سندھ میں اونچے سیلاب کے باعث تربیلا ڈیم مکمل بھر چکا ہے۔ پھر بھی لاکھوں ایکڑ فٹ پانی ہزاروں دیہات کو تباہ کرتا ہوا سمندر میں جا رہا ہے۔ واپڈا کے مطابق اس سیزن میں اب تک چھ لاکھ ایکڑ پانی سمندر میں گر چکا ہے اور مزید گرنے والا ہے۔ اتنے پانی سے ایک کالا باغ ڈیم پورا بھرا جاسکتا تھا جو سردی کے موسم میں اور خشک سالی کے برسوں میں نعمت عظمیٰ ثابت ہوتا۔ کالا باغ ڈیم تو سیاست کی نذر کر دیا گیا۔ چند برسوں سے ہمارے حکمران بھاشا ڈیم کا چرچا کر رہے ہیں لیکن اس پر کام شروع نہیں کیا گیا۔ حکمرانوں پر موٹرویز بنانے کی دھن سوار ہے۔ ملک کی زراعت اور آبپاشی کا نظام ان کی ترجیحات میں بہت نیچے ہے۔ حکمران ایسے کاموں کو ترجیح دیتے ہیں جن کے پر اپنی گتے سے ان کو مقبولیت حاصل ہو سکے جبکہ ٹھوس دیر پا کام جن سے ہماری بقا کا تعلق ہے، نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ آبادی بڑھ رہی ہے۔ آبی وسائل کم ہو رہے ہیں۔ جب ہی ملک بنا تو یہاں ساڑھے تین کروڑ لوگ آباد تھے، اب بیس کروڑ ہو چکے ہیں۔ ایک نسل کے بعد یہ آبادی

پینیتس کروڑ ہونے کا اندازہ ہے۔ اس تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے پانی کا ایک ایک قطرہ قیمتی ہے۔ عالمی اداروں کی تحقیقات کے مطابق دنیا میں آئندہ جنگیں پانی کے مسئلہ پر ہوں گی لیکن ہمارے عاقبت نااندیش حکمران خدا کی نعمت کو ضائع کر رہے ہیں۔

باب ششم پانی کا بحران

کرہ ارض پر صاف پانی کی کمی

بالیوڈ کے ایک جریدے نے ملائیشیا کی ایک کمپنی کے حوالے سے لکھا ہے ملائیشیا میں ایک ایسی مشین ایجاد کی گئی ہے جو مسلمانوں کو پانی کے اسراف کے بغیر وضو کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوگی۔ سبز رنگ سے مزین یہ مشین خود کار (حساس آلات) اور میسن کی حامل ہے اس طرح پانی کے ضیاع کو روکنے میں مدد ملے گی۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد لگ بھگ 7 ملین ہے۔ افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور انہی علاقوں میں پانی کی قلت ہے۔ مشین کے موجد اے اے سی ای (AACE) نے ان مشینوں کی فروخت کے لیے افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے دولت مند ممالک پر انحصار کیا ہے۔ یہ مشین جس کی قیمت 3 سے 4 ہزار ڈالر ہوگی، آئندہ چھ ماہ میں مارکیٹ میں لائی جائے گی۔ لوگوں کو پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے مختلف طریقے اور ایک نئی ترغیب دی جائے گی جو روایتی طریقہ کار کے بجائے ہائی ٹیک طریقے پر مبنی ہوگی۔ کمپنی کے صدر انھوں نے گومرنے پریس کو بتایا کہ روایتی طریقہ وضو میں بہت سا پانی ضائع ہوتا رہتا ہے۔ گومرنے کو الالبور میں اس مشین کی لانچنگ کے وقت یہ تمام تفصیلات اخبار نویسوں کو بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس آلہ یا مشین میں ریکارڈ شدہ قرآنی آیات کو ایک مخصوص بٹن دبا کر سنا بھی جاسکے گا۔ مشین کی اونچائی لگ بھگ پانچ فٹ ہے۔ اس سے وضو کرنے میں صرف 1.3 لیٹر پانی خرچ ہوگا۔ زمانہ حج کے دوران لگ بھگ 20 لاکھ عازمین حج کے لیے روزانہ وضو کے لیے 50 ملین لیٹر پانی استعمال ہوتا ہے جبکہ اس مشین کے استعمال سے یومیہ صرف 10 ملین لیٹر پانی صرف ہوگا۔ ایسی صورت میں 40 ملین لیٹر پانی کی آسانی سے بچت ہو سکے گی۔ دبئی نے اپنے ایئر پورٹ کے لیے اس مشین کو خریدنے کا آرڈر دیا ہے۔ کمپنی کے صدر گومرنے بتایا کہ اس مشین کی تیاری میں دو سال کا عرصہ لگا۔ تقریباً 50 لاکھ ڈالر خرچ آیا لیکن ہمارا تجربہ بے حد کامیاب رہا۔ ملائیشیا کے مسلمانوں نے اس

ہائی ایک مشین کے تعلق سے ملے جلے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ پانی کے ضیاع کو روکنے کے لیے یہ ایک بہترین ایجاد و اقدام ہے کہ جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اٹھایا گیا ہے۔ بعض دیگر مسلمانوں کا خیال ہے کہ اس ملک میں پانی ارزاں ہے اس لیے مشین کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ ایک صحافی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ قدرتی وسائل کے تحفظ میں مشین بے حد مددگار ثابت ہوگی۔ ہمیں انسانیت اور آنے والی نسلوں کے لیے نئی اشیاء ایجاد اور سہولتیں فراہم کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے اقدام کرنا ہوں گے اور ان میں ایک بڑا مسئلہ کرہ ارض پر صاف شفاف پانی کی کمی بھی ہے۔ ادھر اقوام متحدہ نے ایک بے حد اہم وارننگ دی ہے کہ انسان کرہ ارض کے وسائل کا بے دریغ اور بے دردی سے استعمال کر رہا ہے جس کو فوری طور پر روکا جانا چاہئے ورنہ بڑے پیمانے پر ایک عالمگیر تباہی و بربادی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دنیا میں پانی کے ذخیروں کو تباہ کن طریقے سے آلودہ کیا جا رہا ہے، دستیاب پانی فی الحال سالانہ 45 فیصد استعمال ہو رہا ہے اور اس میں سے دو تہائی زرعی مقاصد کے لیے زیر استعمال ہے۔ سال 2025ء میں یہ کھپت 70 فیصد ہو جائے گی جبکہ 4.5 بلین لوگ جو دنیا کی آبادی کا 45 فیصد حصہ ہوں گے وہ ایسے ملکوں کے باشندے ہوں گے جن کی فی کس 50 لیٹر پانی کی بنیادی ضرورت بھی پوری نہ ہو سکے گی۔ آئندہ پچاس برس میں یعنی 2063ء میں دنیا کی آبادی لگ بھگ دس بلین ہو جائے گی۔ چین اور جنوبی ایشیاء پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش وغیرہ میں زیر زمین پانی کی سطح ابھی سے ہر سال ایک میٹر کے لگ بھگ نیچے اترتی جا رہی ہے۔

آج بھی دنیا کے ایک ارب 20 کروڑ افراد کو صاف پانی میسر نہیں ہے اور ترقی پذیر ممالک میں 95 فیصد گند پانی اور 70 فیصد صنعتی گندگی دریاؤں، نہروں، ندی نالوں اور کھالوں میں بہادی جاتی

ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس صدی میں پانی تیل کی طرح قیمتی اشیاء میں شامل ہو جائے گا اور اگر ایسا ہو تو سب سے زیادہ فائدہ آسٹریا کو ہو گا کہ یہ ملک آبی وسائل سے مالا مال ہو گا اور وہ سعودی عرب کے تیل کی طرح پانی سے مالا مال ہو جائے گا۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ہر تین سیکنڈ میں ایک بچہ پانی کی مناسب سپلائی نہ ہونے کی وجہ سے بیمار ہو کر مر جاتا ہے اور جیسا کہ ہم بھی جانتے ہیں مغربی ممالک میں آگ اور سورج کو مرکزیت حاصل ہے تو مشرق میں پانی کے مختلف ذرائع مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہاوت ہے کہ سادہ پانی صرف گھوڑے پیتے ہیں چنانچہ پانی کے بجائے مغربی ممالک کے باشندے شراب سے پیاس بجھاتے ہیں لیکن یہی شراب سے تشنگی بجھانے والی قومیں پانی کی اہمیت سے آگاہ ہو رہی ہیں اور اب یہ بھی معترف ہیں کہ قدرت کا بہترین مشروب صاف و شفاف پانی ہے کہ پانی زندگی کو پروان چڑھاتا ہے، پانی صحتِ بدن کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ دوسری طرف پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کا سب سے اہم مسئلہ پینے کا صاف پانی ہے۔ گندے پانی سے امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ (اس کی تازہ اور افسوس ناک مثال پاکستان میں ڈینگی مچھر یا بخار کا حملہ ہے) اعداد و شمار کے مطابق پچھلے ہیں برسوں میں اندازے سے کہیں زیادہ بیماریوں نے ترقی پذیر ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی کو زندگی اور جیون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سائنس دانوں نے تشویش ظاہر کی ہے کہ دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی آبادی کو طوفان اور پھیلی ہوئی آلودگی کے باعث پانی کے لیے جنگوں کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ جرمنی کے پروفیسر ولیم ہاگن نے کہا ہے کہ ہم تیل پر جنگیں لڑ چکے یہ ہماری زندگی ہی میں لڑی گئیں اس طرح پانی پر بھی جنگیں ممکن ہیں۔ یہ ہماری زندگی ہی میں ہوں یا آئندہ نسل اس کا خمیازہ گھٹتے۔ یہ بات اس رپورٹ میں کہی گئی ہے جو ورلڈ واٹر ویک (WWW) کے ختم ہونے پر کتابی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

کتاب میں کہا گیا ہے متمول ممالک میں لاعلمی اور اطمینان بخش صورت حال نظر آرہی ہے جو اچھی علامت نہیں۔ امریکہ کے پروفیسر نیچرل ریسورسز مچل نے کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ناآسودہ علاقوں کو خشک سالی، وبائی امراض اور پانی کے حقوق پر متوقع جنگوں سے کون روکے گا؟ اور اس حقیقت سے کون جھنجھوڑے گا؟ انھوں نے کہا کہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیاء (ہم بد نصیب پاک و ہند) ان ممالک میں شامل ہیں جہاں ان جنگوں کا خطرہ ہے۔ اس بات کی نشاندہی کی جا چکی ہے کہ پاکستان 2018ء تک پانی کی انتہائی قلت والا ملک بن جائے گا۔ پاکستان میں فی کس پانی کی فراہمی جو گزشتہ صدی (1951ء) میں 5650 مکعب میٹر تھی، 1999ء میں 1450ء مکعب میٹر رہ گئی تھی جبکہ آئندہ چند برسوں میں یہ مزید کم ہو کر ایک ہزار مکعب میٹر کو بھی نہیں چھو پائے گی اور کشور حسین شاد باد میں موجود زیر زمین پانی کی سطح لگ بھگ 50 فٹ مزید نیچے چلی جائے گی۔ آج ہمارا (پاکستان و بھارت) سب سے اہم مسئلہ پانی کا حصول ہے نہ کہ جنگ و جدل۔ اس لیے ہمیں (پاک و ہند) اس طرح زیادہ توجہ دینی چاہئے تاکہ ہمیں صاف و شفاف پانی میسر آ سکے کہ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ پانی ہی ہماری شہ رنگ ہے اور پانی ہی اٹوٹ انگ ہے۔

باب ہفتم

توانائی

توانائی بحران کے مضمرات اور زمینی حقائق

توانائی کے بحران نے اس ملک اور عوام کو بد حالی کے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ بجلی، گیس اور پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں تسلسل کے ساتھ بڑی بے رحمی سے اضافہ کیا جا رہا ہے۔ 80ء کی دہائی میں اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ 2015ء تک پاکستان میں توانائی کے ذخائر میں کمی ہو جائے گی اور یہ ہماری آبادی اور ضرورت کے اندر بڑے فرق کے سبب بحران کی شکل اختیار کرے گی۔ آبادی میں اضافہ تو اسی تسلسل سے رہا لیکن دستیاب وسائل کو قابل وسائل بنانے اور نئے وسائل کی تلاش کا کام اس جذبے کے ساتھ نہیں ہوا جو پاکستان کو درکار تھا۔ بحران مہنگائی کا ہو یا توانائی کا اس کا اجتماعی کس ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں صبح 8 بجے کاروباری مراکز کھل جاتے ہیں۔ دفاتر میں کام شروع ہو جاتا ہے جبکہ توانائی کے بحران کے شکار ملک پاکستان میں کاروبار زندگی صبح 8 بجے کے بجائے دوپہر 122 بجے کے بعد شروع ہوتا ہے اور رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک میں جہاں سردست توانائی کا بحران نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں شادی کی تقاریب دن میں ہوتی ہیں اور وہ دن کی روشنی کا بھرپور استعمال کرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں یہ تقاریب رات گئے تک جاری رہتی ہیں اور اس میں بجلی کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے۔ ہماری آنکھ اس بات کا بھی مشاہدہ کرتی ہے کہ اگر کسی سڑک یا شاہراہ پر کوئی نیا پلازہ یا شاپنگ سنٹر تعمیر ہوتا ہے تو اس کے پروپیگنڈے کے لیے پوری سڑک کو بفعہ نور بنادیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات سڑک پر سٹریٹ لائٹس بھی دن میں روشن نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ ٹھیلوں اور پٹھورے والوں کو بھی رشوت لے کر غیر قانونی کنکشن دے دیے جاتے ہیں اور وہ رشوت سے کہیں زیادہ مالیت کی بجلی استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

توانائی کے بحران کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ وہ افراد جو صبح سے شام تک اپنے دفاتر میں رہتے ہیں وہ بھی اپنی گاڑیاں انفرادی طور پر استعمال کرتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں ایسے افراد ششل یا پبلک ٹرانسپورٹ کو استعمال کرتے ہیں، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں ایک لاکھ گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں، وہاں چند ہزار گاڑیوں سے ہی شہر کا کام چلتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہمارے ہاں احساس برتری کے سبب ہوتا ہے۔ وسائل کے اعتبار سے ہم ایک پسماندہ قوم بنتے جا رہے ہیں لیکن رسم و رواج اور طور طریقوں کے اعتبار سے ہم ایک شاہانہ قوم بننے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوشش ہمارے آنے والے مستقبل کو تاریک کر سکتی ہے جس کے اثرات نمودار ہونا شروع ہو گئے ہیں، لہذا تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد، سماجی تنظیمیں بالخصوص سیاسی جماعتیں حکومت پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر پر بھی زور دیں کہ بحیثیت معاشرہ اور فرد ملک ہم سے کیا تقاضا کر رہا ہے اور ہماری کیا ذمہ داریاں بنتی ہیں اور ہم کس طرح سے قناعت پسندی کی طرف راغب ہو سکتے ہیں اور ہم کسی طرح سے احساس برتری سے باہر نکل کر قومی مفاد میں سوچیں گے۔ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم پاکستان کے مسائل کے حل کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں اور پھر حکومت پر دباؤ بڑھائیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور یہ سوچ شعبہ تعلیم صحت، امن و امان اور باہمی ہم آہنگی تمام شعبوں میں پیدا ہونی چاہئے۔ پاکستان کی یہ بد قسمتی رہی ہے کہ 63 سال سے صحرائے تھر میں دفن دنیا کے ساتویں بڑے بلیک گولڈ (کوئلے) کے 175 بلین ٹن کے ذخائر جو سعودی عرب، مشرق وسطیٰ اور ایران میں تیل کے مجموعی ذخائر سے زیادہ 20 ہزار ٹریلین کیوبک فٹ گیس کے برابر اور پاکستان کے گیس کے ذخائر سے 68 گنا زیادہ ہیں، کو ہم 63 سال میں زمین سے نکال کر ملک کی توانائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے استعمال نہیں کر سکے۔ کیا یہ پاکستان کو تیل سپلائی کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کی سازش تھی یا ہماری نا

اہلی۔ بہر حال سزا تو قوم کو ملی۔ نہیں تو آج ہمارا ملک صنعتی طور پر خطے کے دوسرے ممالک کی طرح نہایت ترقی یافتہ ہونا۔ پاکستان میں ہمارا توانائی کا شعبہ 50 فیصد گیس، 29 فیصد آئل، 11 فیصد پن بجلی (ہائیڈرو) 7.6 فیصد کوئلے اور نیوکلیر انرجی پر مشتمل ہے۔ ملک میں پانی سے 40 ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے لیکن ہم پانی سے صرف 6 ہزار 5000 میگا واٹ بجلی پیدا کر رہے ہیں۔ ہم نے اب تک اپنے کوئلے کے ذخائر کو بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جبکہ کوئلے سے امریکہ میں 52 فیصد بجلی، برطانیہ میں 58 فیصد، آسٹریلیا میں 71 فیصد، چین میں 78 فیصد، جرمنی میں 58 فیصد، بھارت میں 77 فیصد جبکہ پاکستان میں کوئلے سے صرف 2 فیصد بجلی حاصل کی جاتی ہے۔

کراچی میں دو سال قبل ایک اہم کانفرنس میں نامور ایٹمی سائنسدان اور منصوبہ بندی ڈویژن کے ممبر ڈاکٹر شرم مبارک مند نے کہا تھا کہ پاکستان کی توانائی کے شعبہ میں خود کفالت محض 3-4 سال کے فاصلے پر ہے، تھر کول کے ذخائر سے پاکستان میں کئی سو سال تک 40 ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ تھر کے ذخائر کو جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے زمین کے اندر ہی گیس میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور اس گیس کو مائع اور ایندھن میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس پر ایک پریزنٹیشن بھی دی اور پھر اسلام کوٹ میں زیر زمین 450 فٹ گہرائی میں یوسی جی ٹیکنالوجی کے ذریعے 11 دسمبر کو کوئلے کو جلایا گیا۔ 18 دسمبر کو کوئلے سے گیس بننے کا عمل شروع ہوا جس کے بعد 19 دسمبر کو شعلہ جلا کر گیس کے حصول کا تجربہ کامیابی

سے ہمکنار ہوا۔ پاکستان میں اس وقت بجلی کی فی یونٹ قیمت 12 روپے ہے جبکہ رینٹل پاور سے بھلی 12 سے 17 روپے فی یونٹ حاصل ہو رہی ہے۔ ماہرین کے مطابق تھر کول سے حاصل ہونے والی

بجلی کی قیمت صرف 4.5 روپے فی یونٹ ہوگی جس سے ملک میں صنعتی انقلاب آسکتا ہے اور پاکستان 106 سے 11 بلین ڈالر کا پٹرولیم مصنوعات کی درآمدات کا بل فیصد 60 تک کم ہو سکتا ہے۔ سندھ میں 1182 ارب ٹن کوئلے کے ذخائر ہیں جبکہ پنجاب میں 235 ملین، بلوچستان میں 217 ملین، خیبر پختونخواہ میں 90 ملین اور آزاد کشمیر میں یہ ذخائر 9 ملین ٹن کی مقدار میں ہیں۔ ہمارے تھر کول کے ذخائر 200 فٹ گہرائی میں ہیں۔ 2005ء میں ایک نئی ٹیکنالوجی دریافت ہوئی جس سے زمین میں پائپ ڈالے جاتے ہیں، ایک پائپ کے ذریعہ ذخائر کے اندر آگ لگائی جاتی ہے جبکہ دوسرے پائپ کے ذریعے بننے والی گیس باہر آ جاتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے چین، امریکہ، آسٹریلیا، ازبکستان اور جنوبی افریقہ سمیت متعدد ممالک میں بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ تھر کول کے 8 بلاکس ڈویلپ کئے گئے ہیں، 2 بلاکس کسی ملکی وغیرہ ملکی کمپنیوں کو دیے جا چکے ہیں جبکہ بلاک سرمایہ کاری کے لیے موجود ہیں۔ بلاک نمبر 2 میں 1200 میگا واٹ بجلی پیدا کرنے کا معاہدہ کیا ہے، اس بلاک میں 24 لاکھ ٹن کوئلے کے ذخائر ہیں جہاں سے 30 سال تک 4 ہزار میگا واٹ سالانہ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ بلاک نمبر 3 آسٹریلیا کی بین الاقوامی کمپنی کو دیا گیا ہے جس میں کوئلے سے گیس پیدا کر کے 400 میگا واٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ بلاک نمبر 4 متحدہ عرب امارات کے گروپ کو دیا گیا ہے، اس بلاک سے ایک ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ بلاک نمبر 5 جو منصوبہ بندی ڈویژن کے پاس ہے سے 40 سال تک بلا تھقل، ہزار میگا واٹ بجلی اور 100 ملین بیرل ڈیزل سالانہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال اس بلاک سے 100 میگا واٹ بجلی 2013، تک پیدا کی جاسکے گی۔ بلاک نمبر 6 برطانیہ کی بین الاقوامی کمپنی کو دیا گیا ہے، اس بلاک سے 600 میگا واٹ بجلی پیدا کی جائے گی جبکہ بلاک نمبر 8 کے 43 اور 5 ذیلی بلاک سرمایہ کاری کے لیے موجود ہیں۔ تھر کول فیلڈ کو سپیشل اکنامک زون قرار دیا گیا ہے جہاں سرمایہ کاری پر ڈالرز کی بنیاد پر 20 فیصد منافع کی ضمانت دی گئی

ہے۔ ان ذخائر کے استعمال سے آئندہ 200 سال تک ایک لاکھ میگاواٹ بجلی سالانہ پیدا کی جاسکتی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2012-13ء میں ملک میں گیس کی یومیہ کمی 2 بلین کیوبک فٹ، 2014-15ء میں 2.5 بلین، 2015-16ء میں 3 بلین اور 2012-17ء میں 3.5 بلین کیوبک فٹ سے زیادہ ہو سکتی ہے لہذا یہ ضروری ہے کہ مستقبل میں توانائی کے اس بحران سے نمٹنے کے لیے متبادل انتظامات ہنگامی بنیادوں پر کیے جائیں کیونکہ ہمارے موجودہ گیس کے ذخائر آئندہ 20 سالوں میں ختم ہو سکتے ہیں۔ وزارت پٹرولیم کے مطابق ملک میں قدرتی گیس کے ذخائر میں کمی اور روایتی ایندھنوں کی قیمتوں میں اضافے کے باعث آئندہ چار سے پانچ سال کے دوران ہمارا انحصار ایل پی جی اور ایل این جی گیس کی درآمد پر ہو گا لیکن اس سے ہمارے امپورٹ بل پر منفی اثرات پڑیں گے۔ وزیر اعظم نے حال ہی میں ڈاکٹر ثمر مبارک سے ملاقات کے دوران ان کے پروجیکٹ جس کی مالیت 155 ملین ڈالر ہے سے 2013ء تک 100 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے لیے فوری طور پر 2.4 ارب روپے فراہم کرنے کے احکامات دیے ہیں جبکہ 78 ارب روپے آئندہ مالی سال کے بجٹ سے فراہم کیے جائیں گے۔ امید ہے کہ زیر زمین بلیک گولڈ سے گیس حاصل کر کے ہم ملک میں توانائی کے بحران پر مستقل بنیادوں پر قابو پا سکتے ہیں۔

توانائی کے سستے ذرائع استعمال کرنا ہوں گے

پاکستان کو اس وقت توانائی کے جس سنگین بحران کا سامنا ہے اس کا اندازہ ملک کے طول و عرض میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ اور قدرتی گیس کے ذخائر بتدریج کم ہونے کے نتیجے میں ہزاروں کارخانوں کی بندش اور کاروبار زندگی میں جمود کی کیفیت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں تک قدرتی گیس کا

معاملہ ہے تو کہا جا رہا ہے کہ ملک کو اس وقت یومیہ 400 ملین کیوبک میٹر قدرتی گیس کی کمی کا سامنا ہے جو 2025 تک بڑھ کر 1000 ملین کیوبک میٹر تک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں موجودہ گیس کے ذخائر تیزی سے کم ہو رہے ہیں جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جامشورو میں قدرتی گیس سے ایل پی جی نکالنے کی مقدار 30 فیصد سے 35 کم ہو گئی ہے۔ پاکستان کی معاشی ترقی کا دار و مدار ملکی توانائی کی ضروریات پورا کرنے پر ہے۔ ملک میں فرنس آئل سے بجلی بنانے پر اربوں ڈالر زر مبادلہ خرچ ہو رہا ہے، اگر ہم اپنی اس بجلی کو فرنس آئل کی بجائے گیس یا دیگر متبادل توانائی کے ذرائع سے حاصل کریں تو ناصرف ہمیں سستی بجلی حاصل ہوگی بلکہ ہم اپنے ملک کے لیے کثیر زر مبادلہ بھی بچا سکتے ہیں۔ پاکستان میں زیادہ تر بڑی صنعتیں گیس کے ذریعے خود بجلی پیدا کر رہی ہیں اس کے باوجود ملک میں گیس کی کھپت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور بات اب گیس کی لوڈ شیڈنگ پر پہنچ گئی ہے۔ ان سنگین حالات میں پاکستان 1990ء سے گیس پائپ لائن کے ذریعے قدرتی گیس حاصل کرنے کے مختلف منصوبوں پر کام کر رہا تھا جس میں ترکمانستان، افغانستان، پاکستان، انڈیا گیس پائپ لائن (TAPI)، ایران، پاکستان، انڈیا گیس پائپ لائن (IPL) اور قطر، پاکستان زیر سمندر پائپ لائن کے منصوبے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وزارت پٹرولیم 3.5 ملین کیوبک فٹ یومیہ کے حساب سے مائع گیس قطر سے حاصل کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے، اس منصوبے پر تقریباً 2 ارب ڈالر سالانہ کی لاگت آئے گی لیکن بد قسمتی سے ان میں سے کسی پر اجیکٹ کو ابھی تک عملی شکل نہیں دی جاسکی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان کو توانائی کی کمی کی وجہ سے تقریباً 45 ارب روپے سالانہ نقصان ہو رہا ہے اور اگر فوری طور پر قدرتی گیس کے متبادل ذرائع استعمال میں نہ لائے گئے تو یہ نقصان ناصرف کئی گنا بڑھ جائے گا بلکہ ملک میں ہونے والی نئی صنعت کاری اور سرمایہ کاری کا

عمل بری طرح متاثر ہو گا۔ ملک میں نئی ملازمتوں کے مواقع میں کمی واقع ہوگی جس سے غربت میں اضافہ ہو گا اور حکومتوں کو سنگین سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایران، یمن اور قطر خطے میں قدرتی گیس کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اسی سلسلے میں وزیراعظم کے مشیر نے حال ہی میں یمن کے وزیر پٹرولیم اور یمن میں گیس کے اعلیٰ عہدیداران سے ملاقات کی۔ واضح رہے کہ تمام ترقیاتی ممالک اپنی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف ممالک سے ہنگامی بنیاد پر طویل المیعاد معاہدے کر رہے ہیں۔ اس وقت ایران تقریباً 200 ملین کیوبک میٹر قدرتی گیس پیدا کر رہا ہے جس میں سے 400 ملین کیوبک میٹر گیس اس کی اپنے ملک میں کھپت ہے لیکن 2015ء تک ایران کا اپنی گیس کی پیداوار کو بڑھا کر 1000 ملین کیوبک میٹر تک بڑھانے کا پروگرام ہے۔

پاکستان نے 13 جون 2010 کو ایران پاکستان گیس پائپ لائن کے 7.5 بلین ڈالر کے گیس کے منصوبے، جس کو امن کی پائپ لائن کا نام دیا گیا ہے پر ایران کے نائب وزیر پٹرولیم جاوید اوجی نے پاکستان کے وفد کے ساتھ تہران میں دستخط کیے جس کی رو سے 2014ء سے ایران پاکستان کو یومیہ 750 ملین کیوبک میٹر قدرتی گیس 25 سال تک فراہم کرے گا جو ہماری اس وقت استعمال ہونے والی گیس کے حجم کا تقریباً 20 فیصد ہو گا، اس گیس کی سپلائی کو 5 سال کے لیے مزید بڑھایا جاسکتا ہے اور گیس کی مقدار کو بھی بڑھا کر 1000 ملین کیوبک میٹر یومیہ کی جاسکتی ہے جس کے لیے پاکستان کو 700 کلومیٹر 142 انچ پائپ لائن مکران کو شٹل ہائے وے پاک ایران بارڈر پر ڈالنا پڑے گی تاکہ یہ پائپ لائن نواب شاہ گیس منتقلی کے موجودہ نیٹ ورک تک لائی جاسکے جس کی لاگت کا تخمینہ 1.65 ارب ڈالر لگایا گیا ہے اور اس کی تنصیب میں تقریباً 3 سال کا عرصہ لگے گا۔

ایران نے اپنی جنوبی گیس فیلڈ سے گیس سپلائی کرنے کے لیے پہلے ہی 907 کلو میٹر گیس پائپ لائن اصلید اور ایرانشہر کے مابین ڈال دی ہے اور مزید 300 کلو میٹر پائپ لائن جنوب مشرقی شہر ایرانشہر سے پاکستانی بارڈر تک ڈالنی ہے۔ اس منصوبے سے پاکستان اپنی بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے 5000 میگا واٹ بجلی پیدا کر سکے گا۔ ملک میں انرجی کی قلت کے پیش نظر حکومت کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ اوجی ڈی سی جس کے پاس انفراسٹرکچر موجود ہے، کو آئندہ 10 سے 15 سالوں میں تیل اور گیس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسے تیل دریافت کرنے کی سرگرمیوں کو تیز کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ پاکستان میں مختلف گیس فیلڈز ایسی ہیں جہاں قدرتی گیس سے ایل پی جی حاصل کرنے کے لیے پلائٹس نصب نہیں کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے روزانہ 500 ٹن ایل پی جی ہوا میں جلا کر ضائع کر دی جاتی ہے جس کی قیمت تقریباً ڈھائی ارب روپے بنتی ہے جو ہمارے قومی وسائل کا ضیاع ہے اور اسے استعمال کیا جائے۔

پاکستان کے لیے امریکہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک نے اپنے حالیہ دورہ پاکستان میں کہا ہے کہ ایران کے خلاف پابندیوں کے لیے یکم جولائی کو امریکی صدر اوبامہ نے اس بل پر دستخط کر دیے جس کی رو سے پاک ایران گیس پائپ لائن منصوبہ متاثر ہو سکتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کو اس منصوبے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے جبکہ حکومت پاکستان کا کہنا ہے کہ ایران پر پابندیوں سے پاک ایران گیس منصوبے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ اس پر گزشتہ 20 سالوں سے بات چیت ہو رہی تھی اور یہ معاہدہ سلامتی کونسل کی ایران پر پابندیاں عائد کرنے سے پہلے عمل میں آیا تھا۔ یہ ہمارے ملکی مفاد میں ہے کہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے کیونکہ اس منصوبے سے بلوچستان اور سندھ کے پسماندہ علاقوں میں تکنیکی تربیت اور نئی ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوں گے اور ان علاقوں میں سماجی خوشحالی آئے گی۔ اس کے علاوہ ماحول دوست فیول کے استعمال سے

پاکستان کو کاربن کریڈٹس بھی حاصل ہوں گے جس کو بین الاقوامی مارکیٹ میں بیچ کر خطیر رقم حاصل کی جاسکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حکومت پاکستان قومی مفاد میں امریکی دباؤ کس حد تک برداشت کرتی ہے۔ دوسری طرف بھارت بھی ایران کے ساتھ (SAGE) منصوبے کے تحت بحیرہ عرب کے راستے دونوں ممالک اس بلین ڈالر کے گیس پائپ لائن منصوبے پر بات چیت کر رہا ہے جس میں 100 کلومیٹر ایران کی چابہار گیس فیلڈ سے بھارت کے شہر گجرات گیس پائپ لائن کی تنصیب شامل ہے۔ ایران سے گیس پائپ لائن منصوبے کے ساتھ ساتھ ہمیں سول نیوکلیئر توانائی کے حصول کے لیے بھی سنجیدگی سے کوششیں کرنی پڑیں گی۔ بھارت نیوکلیئر توانائی کے حصول کے لیے جارحانہ طور پر امریکہ، کینیڈا اور دوسرے ممالک سے معاہدے کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی صنعتوں کے لیے سستی انرجی حاصل کر سکے۔ ہمیں بھی بین الاقوامی منڈیوں میں اپنی مسابقتی سکت برقرار رکھنے کے لیے سستی نیوکلیئر انرجی اپنے صنعتی شعبے کو فراہم کرنا ہوگی ورنہ پیداواری لاگت بڑھنے سے ہم بین الاقوامی منڈیوں میں اپنی مسابقتی سکت اور مارکیٹ شیر کھو دیں گے۔

چین اس سلسلے میں ہمارا سب سے قابل اعتبار دوست ملک ہے اور اس سلسلے میں پاکستان اور چین کے درمیان 300 میگاواٹ کے دو چشمہ III اور چشمہ IV سول نیوکلیئر انرجی ری ایکٹرز کا معاہدہ ہو چکا ہے جس پر ہمیں عملدرآمد کو یقینی بنانا ہوگا۔ یاد رہے چین پاکستان کو پہلے ہی چشمہ I اور چشمہ II سول نیوکلیئر انرجی کے دو ایٹمی ری ایکٹرز فراہم کر چکا ہے جو کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔

یہ ہے امریکی تعاون برائے توانائی

روزنامہ آواز 30 اپریل 2010ء، ص

4 ملک کے موجودہ معاشی حالات کے پس منظر میں پاک امریکہ سٹریٹجک مذاکرات کے اصل نتائج اور فوائد کا اندازہ تو کچھ عرصہ بعد ہی ہو گا لیکن ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ پاکستان کے مطالبات کے جواب میں امریکہ نے فوری طور پر کیری لوگر ہل کی رقم میں سے پاکستان کو 25 ملین ڈالر ہم تھرمل پاور سٹیشنوں کی بحالی کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے جبکہ عملاً یہ رقم ایک تھرمل پاور سٹیشن کی بحالی کے لیے بھی ناکافی ہے۔ اس طرح امریکہ نے افغانستان کا قبل ہم پر ڈالنے کے صلہ میں اونٹ کے منہ میں زیرہ دے دیا ہے جبکہ سول نیوکلیر ٹیکنالوجی دینے کی درخواست کی فائل شیلف میں رکھ دی ہے، یعنی اس کے لیے وہ افغانستان میں پاکستانی فوج اور حکومت کی کارکردگی دیکھنے اور فائنا، وزیرستان وغیرہ میں یقینی امن کے قیام کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرے گا۔ مبصرین کے مطابق امریکہ جانے سے قبل پاکستان نے دو بریف تیار کیے تھے جس میں ایک 52 صفحات اور دوسرا بھی اس سے کچھ زائد صفحات پر مشتمل تھا جس میں ایک بریف تو سی آئی اے کے ڈائریکٹر کے حالیہ دورہ پاکستان کے موقع پر ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان دونوں میں دس سے زائد شعبوں کی ترقی اور بحالی اور دہشت گردی سے متاثرہ معیشت کے نقصان کے تخمینہ کی 50 ارب ڈالر سے زائد کی تفصیل شامل تھی۔ جس کے بعد امریکہ بہادر نے بڑی زبردست مہمان نوازی، پروٹوکول اور بہترین سیشن کے بعد صرف 125 ملین ڈالر کی سپورٹ کا وعدہ کیا تا کہ پاکستان میں توانائی کا بحران حل ہو سکے۔

کوئی امریکہ سے پوچھے یا پاکستانی وفد کے حکام سے کہ کیا اس 125 ملین ڈالر سے پاکستان میں توانائی کا بحران حل ہو جائے گا۔ بہتر ہوتا اگر امریکہ پاکستان میں توانائی کے بحران کے حل کے لیے خود یا عالمی بینک کے ذریعے پاکستان کے بڑے ہائیڈل ڈیمز کے لیے وسائل کی فراہمی کے لیے اقدامات کرتا۔ پاکستان کے موجودہ مشکل اقتصادی حالات میں سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے حصول سے بھی زیادہ اس کی ضرورت تھی کیونکہ یہ ٹیکنالوجی تو امریکہ پاکستان کو جب دے گا جب پاکستان اپنی خود مختاری پر سمجھوتہ کرے گا، اسرائیل سے تعلقات قائم کرے گا۔ تیسرے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو امریکہ کی سیر پر بھیجوائے گا اور چوتھا پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کی چابیاں اقوام متحدہ کے ذریعے حاصل کرے گا۔ رہی ہماری سیاسی قیادت تو اس کے دیدار سکرین پر داخلی ایشوائے زیادہ ہیں کہ اس کے ہاں ان امور کے لیے سوائے بیان بازی کرنے کے کوئی فرصت نہیں۔ انھوں نے قوم کی کیا خدمت کرنی اور قوم کو کیا رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ بہر حال پاک امریکہ مذاکرات کے پس منظر میں کچھ حقائق قوم کے سامنے لانے ضروری ہیں جس کا ہماری وزارت خارجہ کے حکام کو ضرور احساس کرنا چاہیے اور اس حوالے سے امریکہ پر واضح کرنا چاہیے کہ اس وقت پیکو کے سسٹم میں ملتان، جامشورو گدو اور مظفر گڑھ کے چار تھرمل پاور اسٹیشن ایسے ہیں جن کی فنی حالت بڑی دگرگوں ہے۔ صرف ان کی بحالی کے لیے 700 سے 800 ملین ڈالر زرد کار ہیں جبکہ ان کے فرنس آئل استعمال کرنے کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔ کیا اس دورے سے امریکہ سے ملنے والے 125 ملین ڈالر کافی ہیں؟ قوم یہ سوال پاکستانی وفد کے قائدین سے کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اس سے زیادہ تو ان کے دورے کے اخراجات آگئے ہوں گے کیونکہ اس اعلان کے سواباتی سب وعدے ہی وعدے اور فوٹو سیشن ہی ہیں جو ہمارے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی ساری دنیا کو دکھا رہے ہیں کہ ہیلری کلنٹن کے ساتھ ان کی گپ شپ اچھی ہو گئی ہے۔ امریکی سیکرٹری خارجہ اپنے

حالیہ دورہ پاکستان کے بعد پاکستانی حکام کی طبیعت اور مزاج کو خاصی سمجھ چکی ہیں اس لیے ان مذاکرات میں تمام کام انھی کی مرضی اور رضامندی سے ہوا۔ کاش ہمارے حکام امریکی حکام سے کہتے کہ وہ عالمی بینک سے کہیں کہ وہ پاکستان میں اگر کالا باغ ڈیم کے متنازع ہونے کے بعد زبردستی بھاشا ڈیم کو تو متنازع نہ بنائیں کیونکہ عالمی بینک میں موجود با اثر ہندو اور یہودی لابی نے ایک شرط یہ عائد کر دی ہے کہ اس منصوبے کو پہلے پارلیمنٹ سے متفقہ طور پر منظور کرایا جائے لیکن کیا کالا باغ ڈیم کے پس منظر میں بھاشا ڈیم کے منصوبے کی مقننہ سے منظوری ممکن ہے؟

قطعی طور پر اس کا امکان نہیں ہے کیونکہ یہ دنیا کا واحد ڈیم ہے جس کے دوپاؤر ہاؤس ایک صوبہ سرحد اور دوسرا گلگت کے قریب بنیں گے۔ عالمی بینک اور ایشیائی بینک کے حکام سے کوئی یہ پوچھے جس منصوبے کا سنگ بنیاد کچھ عرصہ پہلے صدر پاکستان نے رکھا ہو، کیا اس کے بعد یہ معاملہ پارلیمنٹ میں جائے گا۔ محض اس منصوبے کے لیے وسائل فراہم نہ کرنے والی بات ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ عالمی بینک کے حکام نے پاکستان کی وزارت خارجہ اور وائٹ ہاؤس اور کے حکام کو یہ واضح کیا ہے کہ بھاشا ڈیم کے لیے کوئی بھی وسائل اگر دیے گئے تو براہ راست اس کے نام پر نہیں دیے جائیں گے کیونکہ ایسا نہ کرنے سے بھارت ناراض ہو سکتا ہے اور وہ عالمی بینک سے احتجاج کر سکتا ہے کہ اسے تو کشمیر والے علاقہ میں کسی ہائیڈل منصوبہ کے لیے وسائل نہیں دیے جا رہے، پھر پاکستان کو کیوں دیے جا رہے ہیں۔ یہ ایک آزاد، خود مختار پاکستان کی عالمی بینک کے سامنے پوزیشن کا حال ہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل عالمی بینک کے اس ڈرامے (رویے) کے بعد ایشیائی بینک کے حکام نے پاکستانی حکام سے رجوع کیا اور انھیں پیش کش کی کہ اگر عالمی بینک بھاشا ڈیم کے لیے رقم نہیں دیتا تو پھر ہم دیں گے۔ اس کے بعد ایشیائی بینک کا ایک وفد آیا۔ اس نے ڈیم کے علاقہ میں متاثرین کے ساتھ ہمدردی کا لازوال مظاہرہ کیا۔ اس کے ماہرین نے ماحولیات کے حوالے سے

اس ڈیم کے متاثرین کی بحالی کے لیے یہ حیران کن قدغن لگائی کہ وزارت پانی و بجلی اور واپڈا کے حکام کسی بھی متاثرہ شخص کو ناراض نہیں کریں گے، چاہے وہ کسی بھی پوزیشن میں کیوں نہ ہو۔

عالمی مالیاتی اداروں کے کسی کو سپورٹ فراہم نہ کرنے کے یہ سب حیلے بہانے ہوتے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وزیر پانی و بجلی کے قبول کا لا باغ تو دفن ہو چکا لیکن اب بھاشا ڈیم عالمی اور ایشیائی بینک کے رحم و کرم پر ہے جس کے بننے کے بارے میں ماہرین کی رائے ہے کہ اس کا بنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اُس وقت اس ڈیم کی لاگت کا تخمینہ 1 ارب ڈالر تھا جو اب 1 ارب ڈالر سے بھی بڑھ چکا ہے۔ جبکہ اس میں متاثرین کی بحالی کے لیے ارب سے 5 ارب ڈالر اضافی درکار ہوں گے۔ اس منصوبے کی تعمیر سے قبل شاہراہ ریشم کا 125 کلومیٹر رقبہ کار خد بننے کے لیے ہے سے 8 ارب ڈالر اضافی درکار ہیں تاہم اگر یہ ڈیم بن جاتا ہے تو اس سے 4600 میگا واٹ بجلی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد پاکستان کے پاس دوسرا ہائیڈل منصوبہ داسو ڈیم کا رہ جاتا ہے جو گلگت بشام سے آگے بنانے کی تجویز ہے۔ اس سے 4400 میگا واٹ بجلی حاصل ہونے کا اندازہ ہے جبکہ اس کی لاگت کا اندازہ 60 ارب ڈالر سے زائد کا ہے۔ اس کے لیے ایشیائی بینک کی شرط بڑی عجیب ہے کہ اس کے لیے وہ ایک مرحلہ میں نہیں چار اقساط میں وسائل فراہم کرے گا یعنی اس منصوبے کو تاخیری حربے کا شکار بنایا جائے اور یہ ڈیم چار مرحلوں میں بنے۔ اس سے کیا کیا مسائل پیدا ہوں گے یہ تو انرجی اور خاص کر ہائیڈل انرجی کے ماہرین ہی بتا سکیں گے تاہم حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستانی وفد کے حکام میں سے کسی نے بھی امریکی حکام کے سامنے پاکستان میں ہائیڈل انرجی کا کیس پیش نہیں کیا حالانکہ یہ کیس منوانا اس لیے آسان تھا کہ اس میں امریکہ نے تو کچھ نہیں دینا تھا۔ یہ تو اس کے اکنامک آرمر عالمی بینک وغیرہ نے وسائل فراہم کرنے تھے لیکن اس سے پاکستان میں توانائی کا بدترین بحران حل کرنے میں واقعی مدد مل سکتی تھی لیکن ایسا کچھ سامنے نہیں آیا جس سے قوم کو کچھ

ریلیف مل سکے کیونکہ تھرمل پاور سیکٹر میں امریکی سپورٹ سے پاکستان کا فرنس آئل مزید بڑھے گا اور اس سے ادائیگیوں کا توازن بھی بگڑ سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے بجلی سستی نہیں مزید مہنگی ہوگی اور جب بجلی سستی نہیں ہوگی تو پھر پاکستانی عوام کو ریلیف کیسے ملے گا۔ ہماری صنعتی پیداواری لاگت کیسے کم ہوگی اور ہم اپنی برآمدات کیسے سستی کر سکیں گے۔ اس وقت تو پاکستان عملاً افراط زر برآمد کر رہا ہے جس میں بڑا حصہ بجلی کی پیداواری لاگت کا ہے۔ جب ہماری مصنوعات سستی نہیں ہوگی تو پھر امریکی مارکیٹ تک رسائی صرف نعروں اور مطالبات تک ہی رہے گی۔ بجلی کے موجودہ بحران میں کیا امریکی مارکیٹ تک رسائی کا خواب پورا ہو سکتا ہے قطعی طور پر نہیں۔ اس کے لیے قومی سطح پر سوچنا ہوگا کہ ہماری برآمدات کیسے سستی ہو سکتی ہیں۔ اس وقت ٹیکسٹائل سیکٹر کے بحران میں سب سے بڑا حصہ بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ اور نرخوں میں اضافے کا ہے۔ امریکہ میں تو پاکستانی ٹیکسٹائل مصنوعات برآمد کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ کچھ اور۔ اس لیے ایڈ نہیں ٹرید کے نعرے سے نکل کر ایڈ فار انرجی کا نعرہ لگانا چاہیے۔ قوم کو تو عملی طور پر مسائل سے نجات چاہئے ورنہ پاکستان میں لوڈ شیڈنگ سے بڑھ کر فوڈ شیڈنگ کا بھی سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔ خدا کرے ایسے حالات پیدا نہ ہوں اور پاکستان محفوظ ہاتھوں میں رہے، اسے بچانا سب کا فرض ہے۔

توانائی کا بحران مزید سنگین ہو سکتا ہے

روزنامہ آواز، 12 مارچ 2010 ص 4

دنیا میں توانائی کے بڑے ذرائع تیل، گیس، کوئلہ اور پانی ہیں۔ عالمگیر سطح پر توانائی کی کل کھپت اندازاً 15.7 ارب ہزار واٹ ہے جس میں پٹرولیم مصنوعات کا استعمال سب سے زیادہ ہے۔ ان کا استعمال صنعت و حرقت، تجارتی عوامل، ذرائع نقل و حمل اور گھریلو کام کاج میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں توانائی کا ایک ذریعہ نیوکلیر پاور بھی ہے اور متبادل توانائی میں شمسی توانائی اور ہوا سے توانائی کی پیداوار اہم ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پروٹیم کے ذخائر موجودہ تیل کی کھپت کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ سولہ سال کے عرصے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے بعد گیس ٹرونومی اور گیس ورک دونوں کے لیے متبادل ذرائع تلاش کرنا ہوں گے ورنہ معیشت کا پیہہ رک جائے گا۔ ماہرین کے مطابق توانائی کا حصول ایک عالمگیر مسئلہ ہے اور ترقی یافتہ کم ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں توانائی کا مسئلہ زیادہ گھمبیر نہیں ہے۔ البتہ پاکستان، بھارت اور ایشیاء کے دوسرے ممالک میں یہ مسئلہ شدید نوعیت کا ہے۔ یورپ اور امریکا میں توانائی کے دوسرے ذرائع بھی ہیں لیکن پٹرولیم مصنوعات ان کی بھی اہم ضرورت ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے تحت مندرجہ بالا ممالک میں توانائی کی طلب 24 فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھ رہی ہے جس میں پٹرولیم مصنوعات کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ ماہرین کے مطابق سال 2010ء میں دنیا میں توانائی کی عالمی طلب 85 بلین بیرل سے بڑھ کر 105 ارب بیرل ہو جائے گی۔ سال 2006ء میں دنیا میں توانائی کی کل پیداوار کا 34 فیصد جنوب مشرقی ایشیاء، پاکستان، ہندوستان اور بحر الکاہل کے ممالک نے استعمال کیا تھا۔ ان ممالک میں فی کس توانائی کی کھپت 18 سو کلو واٹ آورز ہیں۔ خیال رہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ کھپت

2870 کلوواٹ آورز ہے۔ دنیا میں ایک چوتھائی تیل کی کھپت امریکا میں ہے۔ امریکا میں تیل کی کھیت تقریباً 20 ملین بیرل روزانہ ہے۔ اس طرح یورپ کے ممالک میں بھی تیل کی کھپت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایشیا اور بحر الکاہل کو توانائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے سال 2030ء تک 9 کھرب 70 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ پٹرولیم مصنوعات کی عالمی طلب کے باعث عالمی مارکیٹ میں تیل کے نرخوں میں اضافے سے خلیجی ریاستوں کا بجٹ سرپلس رہے گا۔ اگرچہ عالمی مالیاتی بحران کی وجہ سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی معیشتوں کی آمدنی کم رہی تاہم سال رواں 2010ء میں دونوں ملکوں کی معیشتوں کی شرح ترقی تیل کی آمدنی بڑھنے کے فیصد رہنے کی توقع ہے اور جی سی سی ممالک کے بیرونی اثاثے بڑھ جانے کا امکان ہے۔ یاد رہے جی سی سی کے تیل و گیس کے ذخائر 18.3 کھرب ڈالر سے زیادہ کے ہیں۔ علاوہ ازیں اوپیک کی جوڈیشل اتھارٹی نے بجٹ کے لیے 4819 ملین کویتی دینار بھی منظور کیے ہیں۔ پاکستان میں پٹرولیم مصنوعات کی شدید قلت ہے اور اس کی پیٹرولیم مصنوعات کی روزانہ کھپت 3 کروڑ 13 لاکھ 11 ہزار لیٹر ہے۔ وزارت پٹرولیم سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور ایران سے یومیہ لاکھ 7 ہزار بیرل تیل درآمد کرتی ہے۔ پاکستان دنیا کا آٹھواں بڑا تیل درآمد کرنے والا ملک ہے حالانکہ پاکستان خود بھی تیل کی دولت سے مالا مال ہے لیکن یہ تیل ملکی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔

وفاقی ادارہ شماریات کے مطابق سال 2008ء کے پہلے چار ماہ یعنی جولائی تا اکتوبر کی نسبت سال 2009ء کے پہلے چار ماہ کے دوران پٹرولیم مصنوعات کی پیداوار میں 11.43 فیصد کمی ہوئی تھی جب کہ سال 2009ء اکتوبر کی نسبت سال 2009ء میں پٹرولیم کمپنیوں کی پیداوار میں بھی 12.39 فی صد ریکارڈ کمی ہوئی ہے حالانکہ ملک میں جولائی سے اکتوبر 2009ء کے دوران مجموعی طور پر 62 کروڑ 10 لاکھ ڈالر کی سرمایہ کاری سے تیل اور گیس کے شعبوں میں کروڑ ڈالر سے زائد

کی سرمایہ کاری کی گئی تھی۔ مالی سال 2009-2008 و تک تیل کا درآمدی بل 738 ارب روپے سے زیادہ مالیت کا تھا جس میں 429 ارب روپے کی پٹرولیم مصنوعات اور 308 ارب روپے کا خام تیل تھا۔ اکتوبر 2009ء کے دوران پاکستان سے پٹرولیم مصنوعات کی درآمد 3.12 فیصد کی کمی کے ساتھ 4 ارب 99 کروڑ 40 لاکھ روپے تھی۔ مالی سال 2009-10ء کے پہلے پانچ ماہ میں براہ راست بیرونی سرمایہ کاری تیل و گیس کے شعبے میں سب سے زیادہ رہی جس کا حجم 60 کروڑ 73 لاکھ ڈالر تھا۔ بعد ازاں پاکستان میں نجی ریٹیل پاور پلانٹس چلانے کے لیے 2009ء کے آخر تک تیل کی طلب میں 39 فیصد تک اضافہ ہوا جس کی وجہ سے پاکستان اسٹیٹ آئل (پی ایس او) نے 5 لاکھ 20 ہزار ٹن ہائی سلفر فیول آئل کی خریداری کا ٹینڈر جاری کیا۔

سال 2009ء تک ملک میں فرنس آئل کی کھپت 82 لاکھ میٹرک ٹن سالانہ تھی جو رواں سال 2010ء میں بڑھ کر ایک کروڑ میٹرک ٹن سالانہ ہو جائے گی اور اس طرح 8 لاکھ میٹرک من فرنس آئل درآمد کرنا پڑے گا۔ سال رواں 2010 میں پٹرولیم مصنوعات میں برائے نام کمی کے باعث تیل صاف کرنے والے کارخانوں نے فرنس آئل کی قیمت میں کچھ کمی کی ہے جب کہ مالی سال 2009-10ء کی پہلی ششماہی جولائی تا دسمبر کے دوران آئل ریفائنریز میں 7.7 فیصد کمی ہوئی اور پیداوار 4 لاکھ 64 ٹن رہی۔

انڈسٹریز نے سال 2009-2010ء میں بجلی پیدا کرنے کے لیے ایک کروڑ 27 لاکھ میٹرک ٹن فرنس آئل کی کھپت کا اندازہ لگایا ہے جس میں 850 میگا واٹ بجلی کی پیداوار شروع ہو جائے گی، تاہم اس وقت ملک میں بجلی کی کمی کے باعث صنعتیں زوال کا شکار ہیں اور گھر پلو صارفین پریشان

ہیں۔ پاکستان میں ہائیڈل پاور جنریشن میں کمی کے باعث تھرمل پاور پر انحصار بڑھ رہا ہے۔ اس وقت ملک میں ایک ارب 20 کروڑ کعب فٹ گیس کی قلت ہے۔

سال 2010 جنوری میں 30 لاکھ ٹن مائع قدرتی گیس کی درآمد کا معاہدہ طے پائے گا جس سے گیس کی قیمتوں میں استحکام آنے کا امکان ہے، موجودہ حکومت نے ڈیڑھ سال کے عرصے میں پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں متعدد بار اضافہ کیا ہے۔ 30 نومبر 2009ء کے حکومتی نوٹیفیکیشن کے مطابق پٹرول کی قیمت 26 روپے فی لیٹر، لائٹ ڈیزل 60.22 روپے، ہائی اسپید ڈیزل 70.52 روپے، ہائیڈروکین 82.52 روپے، مٹی کا تیل 62.63 روپے فی لیٹر کی گئی۔ یہ اضافہ آئل اینڈ گیس ریگولیٹری اتھارٹی (اوگرا) نے خام تیل کی قیمت میں 5 سے 7 فیصد اضافے کے باعث کیا تھا۔ اس سے قبل پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں کا تعین آئل مارکیٹنگ کمپنیاں کرتی تھیں جن کی وجہ سے نا صرف مہنگائی میں اضافہ ہوا بلکہ بیروں گاری بھی بڑھی اور غربت کا گراف مزید نیچے کی جانب آگیا ہے۔ پٹرولیم مصنوعات کی قیمت کے اضافے کے باعث بین الاقوامی منڈیوں میں پاکستانی مصنوعات کی مقابلے کی سکت ختم ہو گئی ہے جس سے ملک کی آمدنی میں کمی آئی ہے۔ اس عرصے میں پڑوسی ملک بھارت نے پٹرول اور اس کی مصنوعات میں کمی کی۔ وہاں پٹرول کی قیمت کے روپے 40 پیسے اور ڈیزل کی قیمت 5 روپے 90 پیسے کم ہوئی۔ بھارتی وزیراعظم نے پٹرول، ڈیزل، چینی، آٹے اور پان سے سینٹرل ایکسائز ڈیوٹی ختم کر دی تاکہ غریب عوام کو ریلیف مل سکے۔ اس کے برعکس پاکستان میں حکومت ماہانہ 88 ارب روپے پٹرولیم لیوی وصول کر رہی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ پٹرولیم لیوی سے بھی زیادہ جی ایس ٹی ٹیکس اس پر وصول کیا جاتا ہے۔ اوگرا کے پٹرولیم لیوی کے نئے آرڈیننس کے مطابق پٹرولیم مصنوعات پر پیٹرولیم لیوی فلکسڈ ہے اور عالمی مارکیٹ میں تیل کی قیمتوں میں کمی بیشی سے اس لیکس کی شرح میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ دسمبر 2009 میں پٹرول پر

روپے فی لیٹر پٹرولیم لیوی عائد کی گئی جب کہ ہائی اوکٹین پر 14 روپے مٹی کے تیل پر 6 روپے، لائٹ ڈیزل پر 3 روپے اور ہائی اسپید ڈیزل پر 8 روپے فی لیٹر وصول کی جا رہی ہے۔ نیز پٹرول پر جی ایس ٹی 9 روپے، اے پی سی، ہائی اوکٹین پر 11 روپے اے پی سی، لائٹ ڈیزل پر 8 روپے 81 پیسے اور مٹی کے تیل پر 8 روپے 14 پیسے فی لیٹر کے حساب سے جی ایس ٹی میں وصول کی آج رہی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایئر لائنز اور فوج کے ہوائی جہازوں میں استعمال ہونے والے ایندھن جے پی ون اور جے پی فور پر پٹرولیم لیوی وصول نہیں کی جاتی۔ جب کہ جے پی ون کی قیمت 50.70 روپے اور غیر ملکی پروازوں کے لیے 43.71 روپے فی لیٹر ہے۔ نیز حکومت نے پٹرولیم مصنوعات کی قلت دور کرنے کے لیے 15 ارب روپے دسمبر 2009ء میں جاری کیے تھے لیکن اس کے برعکس پاکستان میں تیل صاف کرنے والی آئل ریفائنریز نے اپنی پیداوار میں 40 فیصد کٹوتی کر دی ہے جس کی بنا پر ہوائی جہازوں کے لیے جیٹ فیول (جے پی ون) کی قلت ہو گئی ہے۔ حالانکہ 4 نومبر 2009ء کو وزارت خزانہ نے اس مسئلے کے حل کے لیے 15 ارب روپے پی ایس او کو دینے کا حکم دیا تھا۔ اس کے باوجود یہ رقم پی ایس او کے ذریعے آئل ریفائنریوں کو نہ مل سکی۔ علاوہ ازیں پاکستان اسٹیٹ آئل نے پاک عرب ریفائنری مظفر گڑھ، ملتان، ایک ریفائنری راولپنڈی و نیشنل ریفائنری (این آر ایل) حب بلوچستان کی تقریباً 20 ارب روپے کی ادائیگیاں نہیں کی ہیں۔ اس سرکلر ڈیٹ کے نہ ملنے کے باعث تیل صاف کرنے والی آئل ریفائنریوں تھرپٹ 60 فیصد کر دی۔ اس بنا پر ریفائنریاں 40 فیصد کم پٹرولیم کی مصنوعات تیار کرنے لگی ہیں۔ جنوری 2010ء کے دوسرے ہفتے میں آئل سیکٹر کے قرضوں کا بحران سرکلر ڈیٹ کا معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ پی ایس او کو لیٹر آف کریڈٹ کے لیے 20 ارب روپے کی ضرورت ہے کیونکہ ملک میں 8 روز کی پاور جزیشن کے لیے فرنس آئل کا شاک ہے۔ ان مصنوعات کا دائرہ کار پٹرول، ڈیزل مٹی کا تیل، ہائی اوکٹین، جے پی

ون جیٹ فیول پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں مٹی کا تیل فائنا، کوئٹہ اور پہاڑی علاقوں کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ پی ایس او کی جانب سے ریفائنریوں کو ادائیگیاں نہ ہونے کے باعث ہے جس کی وجہ سے پٹرولیم مصنوعات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ پاکستان میں کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہیں لیکن کوئلے سے صرف چار فیصد بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ ماہرین کے مطابق ملکی گیس کے ذخائر 30 کھرب مکعب فٹ کے ہیں جو غالباً سال 2030ء سے پہلے ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح مستقبل میں توانائی کے حوالے سے ہمیں شدید مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ حکومت سمندر میں تیل، گیس کے ذخائر بھی تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پٹرولیم پالیسی کے اعلان کے بعد ایک بھی کمپنی کو سندھ میں تیل گیس کی تلاش کے لیے دولائسنس بھی جاری کیے گئے ہیں جن میں اندازہ ہے کہ ایک کروڑ ہے لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی جائے گی۔

توانائی بحران کا حل کیا ہے؟

روزنامہ آواز: 28 جنوری 2010ء، اس 4

اس حقیقت سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ توانائی کسی بھی ملک کی ترقی کے بنیادی عوامل میں شامل ہے۔ اس میں کی معاشی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ ہمارا ملک توانائی کی کمی کا شکار ہے جس کی وجہ سے ایک طرف گھریلو صارفین بجلی و گیس کی طویل اور سنگین اور شیڈنگ سے پریشان ہیں تو دوسری طرف صنعت پر اس کے نہایت منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ بجلی و گیس کی موجودہ لوڈ شیڈنگ کے مالی و معاشی نقصانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نقصان کئی ارب ڈالر بنتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت بجلی کی تقریباً 3300 میگاواٹ اور گیس کی MCF800 کی کمی ہے۔ گھریلو، زراعت اور صنعت کی توانائی کی کھپت مسلسل بڑھ رہی ہے اور ایک اندازے کے مطابق 2030 تک پاکستان میں بجلی کی کمی تقریباً 14 فیصد تک پہنچ جائے گی، اگر بجلی کی اس طالب کو پورا نہیں کیا گیا تو اس سے ملک مزید خطرناک صورتحال سے دوچار ہو سکتا ہے۔

ماہرین کے مطابق توانائی کے حوالے سے نہایت افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ گزشتہ 8 سے 10 سالوں میں ہماری بجلی کی طلب میں اوسطاً 8 فیصد سالانہ اضافہ ہوتا رہا لیکن پھلی کی پیداوار میں بہت ہی کم اضافہ کیا گیا جس سے بجلی کی طلب اور سپلائی میں فرق بڑھتا گیا۔ توانائی کی کمی کی بنا پر روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے کی جانے والی بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے کاروباری سرگرمیوں اور زندگی کو مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں میں صنعتوں اور سی این جی اسٹیشنوں کو ہفتے میں کم از کم دو سے تین دن گیس کی ترسیل بند کرنے کے باوجود گیس صنعتی و گھریلو استعمال کے لیے نا کافی ہے۔ بجلی اور گیس کے بحران سے حال ہی میں صنعتوں کے بند ہونے سے ہزاروں صنعتی

ملازمین بیروزگار ہوئے ہیں۔ یہ امر باعث تشویش ہے کہ تکنیکی خامیوں، نامناسب منصوبہ بندی، تیل اور بجلی فراہم کرنے والی کمپنیوں کے مابین سرکلر ڈیٹ کی ایک بڑی رقم کی عدم ادائیگی کی وجہ سے بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کو تیل کی مکمل سپلائی نہ ہونے کی وجہ سے ہم ملک کی بجلی کی کل پیداواری استعداد 18 ہزار 167 میگاواٹ کا صرف 60 فیصد بجلی حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح اس وقت منگلہ ڈیم، وارسک، تربیلا، غازی برو تھا اور چشمہ وغیرہ سے مجموعی طور پر 6444 میگاواٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے جو اپنی پیداواری استعداد سے 34 فیصد کم ہے۔ ہمارے ملک میں 44 فیصد گیس اور 20 فیصد تیل سے بجلی پیدا کی جاتی ہے جس کی مجموعی پیداواری استعداد اربزار 723 میگاواٹ ہے۔ اس میں واپڈا تھرمل ذرائع سے 4829 میگاواٹ، انڈیپنڈنٹ پاور پروڈیوسرز 2609 (IPPS) میگاواٹ اور رینٹل پاور 285 میگاواٹ بجلی پیدا کر رہے ہیں۔ توانائی کے موجودہ بحران کے فوری حل کے لیے سب سے پہلے ہمیں بجلی پیدا کرنے کی موجودہ استعداد کو مکمل طور پر بروئے کار لانا ضروری ہے۔ یعنی وہ بجلی گھر جو بند ہیں یا اپنی استعداد سے کم بجلی پیدا کر رہے ہیں، ان کو پوری استعداد پر چلا کر بجلی حاصل کی جائے۔ جلد بجلی حاصل کرنے کے لیے کرائے کے بجلی گھر لینے پر ایشیائی ترقیاتی بینک نے بھی تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر حکومت پاکستان 2250 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے 14 بجلی گھر کرائے پر لیتی ہے تو اس صورت میں حکومت کو بجلی کے نرخوں میں 43 فیصد مزید اضافہ کرنا پڑے گا۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے مطابق کرائے کے بجلی گھر لگانے سے ایک سال اور نہ لگانے سے دو سالوں میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ ممکن ہے۔ پاکستان کو کرائے کے بجلی گھر حاصل کرنے پر 5 سے 6 ارب ڈالر ادا کرنا ہوں گے جس کا ناقابل برداشت بوجھ ہمارے بیرونی زرمبادلہ کے ذخائر پر پڑے گا۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ حکومت نے ملکی مفاد میں رینٹل پاور پروجیکٹس کے لیے تیسرے فریق (ADB) سے آزادانہ آؤٹ کروانے

کی ہدایت کی جس سے ان کے ملکی معیشت پر مضر اثرات سامنے آئے ورنہ اس کا ناقابل برداشت
 بوجھ ہماری آنے والی نسلوں کو اٹھانا پڑتا۔ پاکستان میں زیادہ تر بجلی درآمد کیے جانے والے فرانس
 آئل سے پیدا کی جاتی ہے جو بہت مہنگی پڑتی ہے۔ ملکی سطح پر تیل کی درآمدات پر سالانہ تقریباً 12
 ارب ڈالر صرف ہوتے ہیں۔ اس لیے ملکی زرمبادلہ کو بچانے اور توانائی کے مسئلے کو مستقل بنیادوں
 پر حل کرنے کے لیے ہمیں متبادل توانائی کے دستیاب ذرائع جیسے کوئلہ، بائیوماس، ہوا اور شمسی
 توانائی کو زیادہ سے زیادہ استعمال میں لانا ہو گا۔ ایک جائزے کے مطابق مذکورہ ذرائع سے تقریباً
 ایک لاکھ میگاواٹ سستی بجلی حاصل کی جاسکتی ہے جس میں سے صرف 40 ہزار میگاواٹ ہائیڈرو
 پاور سے پیدا کی جاسکتی ہے جو توانائی کے حصول کا سب سے سستا ذریعہ ہے لیکن ہم نے ان ذرائع
 سے اب تک صرف 13 فیصد بجلی پیدا کی ہے۔ پاکستان کے دو بڑے آبی ڈیموں ترپلا اور منگلا میں
 خطرناک حد تک پانی کی کمی واقع ہو چکی ہے۔ ایک تجزیہ کے مطابق 91-1990ء میں ہماری کل
 توانائی میں ہائیڈرو کا حصہ 43 فیصد تھا جو اس کے بعد آنے والے دس سالوں میں کم ہو کر 26 فیصد رہ
 گیا جبکہ اسی عرصے میں تھرمل ذرائع سے حاصل کی جانے والی مہنگی بجلی کا ملک کی کل توانائی میں
 حصہ 54 فیصد سے بڑھ کر 71 فیصد ہو گیا جو بجلی کی قیمتوں میں اضافے کا سبب ہے۔

ہمارے مقابلے میں خطے کے دوسرے ممالک اپنے آبی ذرائع سے آبی ڈیمز بنا کر بھرپور فائدہ اٹھا رہے
 ہیں۔ اس وقت چین دو سو فٹ سے زائد بلندی کے 95 اور بھارت 10 بڑے آبی ڈیمز تعمیر کر رہا
 ہے۔ چین دنیا کا سب سے بڑا ڈیم تعمیر کر کے 22 ہزار میگاواٹ پن بجلی پیدا کر رہا ہے۔ اس ڈیم کے
 بننے سے 632 مربع کلومیٹر رقبہ زیر آب آیا ہے، اس کی تعمیل پر سترہ سال لگے ہیں اور یہ ملک کی
 تقریباً آدھی بجلی کی ضروریات پورا کر رہا ہے۔ چین آئندہ 20 سال کی بجلی کی ضرورت اس وقت
 پیدا کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ ہم پچھلے 30 سالوں میں تربیلا ڈیم کی تعمیر کے بعد سوائے منگلا ڈیم

کی اونچائی میں اضافہ کرنے کے علاوہ کوئی قابل ذکر ڈیم نہیں بنا سکے۔ بڑے متنازع آبی ذخائر کی تعمیر کے علاوہ پاکستان کے پاس دریا کے بہاؤ کے ذریعے بھی 25000 میگاواٹ سے زائد بجلی پیدا کرنے کا پوٹینشل موجود ہے لیکن ہم نے ابھی تک اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اس وقت ملک کا سب سے سنگین مسئلہ پانی کی کمی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دریائے جہلم کو لوگ چل کر عبور کر لیتے ہیں۔ اسی طرح دریائے چناب جس میں عموماً 10 ہزار کیوسک پانی بہتا تھا اب وہ کم ہو کر 6 ہزار کیوسک رہ گیا ہے۔ بھارت سے آنے والے دوسرے دریاؤں میں بھی پانی 40 سے 50 فیصد کم ہو گیا ہے۔ معاہدے کے تحت بھارت سے آنے والے دریاؤں کا پانی سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے تو انڈیا اس پانی پر آبی ڈیمز بنا کر اسے استعمال کر سکتا ہے لہذا پاکستان کو چاہئے کہ اس پانی کو ضائع کرنے کی بجائے جلد سے جلد آبی ذخائر بنا کر اپنے زرعی شعبے کی پانی کی ضروریات اور بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرے کیونکہ یہ بات بارہا کہی جا رہی ہے کہ دنیا میں آئندہ جنگیں پانی پر ہوں گی۔

باب ہشتم تعلیم

سائنس کی ترقی

ڈنمارک کے ایک ڈاکٹر Lanay Westergand نے اپنے ساتھی سائنسدانوں کے ساتھ مل کر آئن اسٹائن کی تھیوری Condensation کی مدد سے سورج کی روشنی کی رفتار کو کم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ ڈاکٹر لینی (Lanay) نے اپنی اس تھیوری کا نام بھارتی سائنس دان شیندر ناتھ بوس اور آئن اسٹائن کے نام پر رکھا ہے۔ ان دونوں سائنسدانوں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر کہا تھا کہ سورج کی روشنی کی رفتار کو کم کیا جاسکتا ہے اور یہ بات طے ہے کہ ابھی دنیا میں روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار کسی چیز کی نہیں ہے۔ سائنس دانوں نے ایک خاص پروسس کے ذریعہ روشنی کی رفتار اسے کلو میٹر فی گھنٹہ کر دی ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ انسانی جسم کے سب سے اونچے اور اوپر والے حصے میں موجود ایک چھوٹا سا دماغ کیسی کیسی چیزوں کو اپنے بس میں کر لیتا ہے اور اس سے کیا کیا استفادہ کرتا ہے۔ یہی دماغ کبھی چاند اور مریخ پر پہنچنے کی بات کرتا ہے تو کبھی ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا کی خبر لے لیتا ہے۔ کبھی اپنے مقام پر بیٹھے بٹھائے لاکھوں میل دور اپنے دشمن پر وار کر دیتا ہے۔ یہ دماغ ہی کا کمال ہے کہ کل تک جو سفر مہینوں میں طے ہوتے تھے وہ آج گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہو رہے ہیں۔ یہ سائنس ہی کا کمال ہے کہ سورج جو کہ ایک سیارہ ہے اور سائنسی نظریہ کے مطابق ہزاروں سیاروں میں سے ایک سیارہ ہے ان دنوں نئی کھوج اور ریسرچ کی بدولت سورج اور دوسرے سیاروں کے متعلق نئی نیاتیں اور معلومات سامنے آرہی ہیں۔ جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے کہ کچھ سیارے ایسے بھی ہیں جن کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں کئی ہزار سال کا عرصہ درکار ہے۔ ایک خیال لگ بھگ تین سو برس سے انسان کے ذہن پر مسلط ہے کہ مادہ اور توانائی دو الگ الگ چیزیں ہیں البتہ ان دو اشیاء کے درمیان ایک رشتہ یا تعلق ضرور ہے، آج کے ایٹمی دور میں سائنس نے اس خیال کو ایک دم بدل دیا ہے اور یہ

ماننے پر مجبور کر دیا ہے کہ مادہ اور توانائی ایک ہی شے کے دو مختلف روپ ہیں۔ آج کل یہ خیال بھی خیال خام ثابت ہو گیا ہے کہ مادہ صرف قدرت ہی کی دین ہے۔ مادہ کو ریڈیائی شعاع سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ آئن اسٹائن نے نظریہ اضافت دے کر ہر ایک کو حیرت کدہ میں گم کر دیا ہے کہ کائنات میں ہر شے اضافی ہے یعنی آپ کسی شے کو دیکھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ جو کچھ دیکھ یا سمجھ رہے ہیں وہی درست یا حرفِ آخر ہے۔ وہ شے اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے جو کچھ آپ کو نظر آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس پرانی تھیوریوں اور فارمولوں کو ٹھوس حقیقتوں کو جگہ دیتی آئی ہے اور دیتی رہے گی اور لطف کی بات یہ ہے کہ سائنس سب کچھ منطق اور ناپ تول سے دیتی ہے جبکہ لوگ آج انسانی زندگی کے بارے میں ہر بات کو ماننے کے لیے تیار یا رضامند نہیں ہیں جو کہ کتابیں انھیں بتاتی ہیں۔ سب سوچنے کا ڈھنگ زیادہ تر اسی بات پر منحصر ہے کہ انسان کیا دیکھ سکتا ہے، کیا محسوس کر سکتا ہے اور کیا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس رویہ کو سائنس نے ہی جنم دیا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ انسان کا دنیا کو ایک خاص نظر سے دیکھنا۔

نئے دور کے سائنس دانوں، مفکروں اور دانشوروں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ علم کو انسان کے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہئے اور انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ اچھا ہونا چاہئے اس لیے کہ دونوں انسان ہیں۔ سائنس کی ایک اہمیت اور بھی ہے، اس اہمیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ سائنس کی حد تک ایک عادی کی عقل اور سوجھ بوجھ کے دریچے کھولتی ہے یا نئے رشتے قائم کرنے میں کہاں تک معاون بنتی ہے۔ ان نئے نئے پیدا کیے گئے رشتوں سے ایک نئی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سائنس کا مقصد ہماری سوجھ بوجھ اور علم میں اضافہ کرنا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک نئی قوت کا احساس بھی ہوتا ہے کہ جو جذبہ انسان کو بھرپور عمل کے لیے تیار کرتا ہے وہ سائنس ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے جو لوگ زندگی میں عملی زندگی پر

زور دیتے ہیں وہ صبح معنوں میں سائنس دان کہے جاسکتے ہیں۔ سائنس ہماری مالی، اقتصادی اور سماجی ترقی میں بڑا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ ویسے بھی کتنے موضوعات ایسے ہیں جو دراصل ہماری روزمرہ زندگی کے موضوعات ہیں۔ ایسی زندگی جن میں ہم روزانہ نشو و نما پاتے ہیں، زندہ رہتے ہیں، سانس لیتے ہیں۔ ایسے موضوعات ہماری زندگی سے الگ تصور نہیں کیے جاسکتے۔ چنانچہ ہمارے ارد گرد جس زاویے میں ڈھنگ سے سائنس کا عمل یا اس کا رشتہ ہماری سماجی یا گھریلو زندگی سے جڑتا ہے اس کا علم ہمارے لیے از حد ضروری ہے۔ سائنسی معلومات پڑھ لکھ لوگوں کے لیے اتنی ہی ضروری ہیں جتنی ان کے لیے زندگی کی دوسری باتوں کا علم۔ پرانے زمانے میں سائنسی عمل کو شخصی ملکیت سمجھا جاتا تھا آج کل اس کے معنی خاصے بدل چکے ہیں۔ آج ہر سائنسی ریسرچ، سائنسی عمل اور ہر سائنسی معلومات بنی نوع کا حق بن چکی ہے۔ سائنس صرف سائنس ہوتی ہے۔ آج ہر مذہب میں ایسے پیروکار موجود ہیں جو سختی سے سائنسی قواعد و قوانین پر عمل پیرا ہونے کو مذہب کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، آج کی سائنس کسی ایک حکومت یا کسی ایک ادارے کی جاگیر نہیں رہی یہ تو علم کا بہتا دریا ہے جو چاہے دو گھونٹ بھر لے۔ اس میں عیسائی مسلم، ہندو، سکھ، بدھ مت یا یہودی کا کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ اس بہتے دریا سے علم اور عقل رکھنے والا ہر انسان اپنی پیاس بجھا سکتا ہے، ہر آدمی جو عمل کو زندگی کا حصہ اور اصول بنانے کا قائل ہو وہ اپنی سوچ بوجھ اور کھوج سے علم کے ایسے چشمے تلاش کر سکتا ہے جو اس کے شوق کی پیاس بجھا سکیں۔

تعلیمی امیر جنسی

پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے۔ اسلام اور جمہوریت دونوں میں حقوق العباد کی ادائیگی علم کی فراہمی و حصول کی بہت اہمیت ہے لیکن اکیسویں صدی میں اسلامی جمہوریہ پاکستان تعلیم کے لحاظ سے عالمی اشاریے میں 187 ممالک کی فہرست میں 147 ویں پوزیشن تک پہنچے چلا گیا ہے۔ حقوق العباد کی صورت حال بھی قابلِ رشک نہیں۔ پاکستان کے آئین کے تحت پانچ سے سولہ سال کی عمر تک کے ہر بچے کو تعلیم دینا ریاست اور حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن آئین کے نفاذ یعنی 1973ء سے آج تک آنے والی جمہوری اور فوجی حکومتوں نے یہ ذمہ داری کس قدر اور کس طرح ادا کی ہے یہ ہم سب کے سامنے ہے۔ 1973ء سے پہلے پاکستان میں گورنمنٹ سکولوں کا معیار والدین اور معاشرے کے لیے اطمینان بخش تھا۔ شہری اور دیہی علاقوں میں قائم ان سرکاری سکولوں اور کالجوں نے قوم کو ہر شعبے میں نہایت قابلِ افراد فراہم کیے۔ ان تعلیمی اداروں نے اچھے مسلمان اور اچھے پاکستانی معاشرے کے حوالے کیے۔ 1973ء کے بعد سے گورنمنٹ اسکولوں کے معیار میں انحطاط آنا شروع ہوا۔ جنرل ضیا الحق کے دور میں جہاں دیگر کئی خرابیوں نے پاکستانی معاشرے کی بنیادیں ہلا ڈالیں وہاں تعلیم کو بھی پہلے اسکول اور پرائیویٹ اسکول کے نچلے اور بالائی خانوں میں بانٹ دیا گیا۔ اس طرح پورے ملک میں طبقاتی تقسیم اور مراعات یافتہ و محروم طبقات کے درمیان خلیج کو گہرا کرنے کا اہتمام کیا۔ پاکستان میں تعلیم کے حوالے سے کم از کم چار طبقات وجود میں آچکے ہیں۔ پہلا طبقہ ان طالب علموں کا ہے جن کے والدین امیر یا پرنٹل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا مڈل کلاس، تیسرا لوئر مڈل کلاس اور چوتھا طبقہ غریب و نادار والدین کے بچوں کا ہے۔ ریاست کا فرض تو یہ ہے کہ وہ آئین کے آرٹیکل 25 الف کے تحت پانچ سے سولہ سال تک کے ہر بچے کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کی فراہمی کا اہتمام کرے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس

ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے پاکستانی عوام کی ضروریات اور روایات سے ہم آہنگ نصاب تعلیم کی تیاری اور اس کی تعلیم کے لیے اساتذہ کی معیاری تربیت بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ یہ نصاب قوم کی سماجی اور مذہبی روایات کا حقیقی عکاس ہو۔ اسکول میں دی جانے والی تعلیم وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر شعبے کے نئے تعلیم اور ہنر سے آراستہ افراد فراہم کرنے کا ذریعہ بھی ہو۔ لیکن پاکستان کے تعلیمی اداروں میں رائج نصاب، ہمارے اسکول ٹیچرز کی اہلیت اور ہماری درس گاہوں کا ماحول مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل میں معاون نہیں بن رہے۔ پاکستان میں صرف امیر یا پر مڈل کلاس کے والدین ہی طبقاتی فرق برقرار رکھنے کے لیے اپنے بچوں کو مہنگے پرائیویٹ اسکولوں میں نہیں بھیج رہے بلکہ گورنمنٹ اسکولوں میں اساتذہ کی اکثریت کی کم صلاحیتوں اور غیر معیاری تعلیم کی وجہ سے مڈل کلاس والدین کی اکثریت بھی اپنے بچوں کو مالی مشکلات اٹھا کر پرائیویٹ اسکولوں میں بھیجے پر مجبور ہے۔ ان پرائیویٹ اسکولوں کی فیس ڈیڑھ دو ہزار روپے سے لے کر پچیس ہزار روپے ماہانہ تک اور کہیں اس سے بھی زیادہ ہے۔ بعض مہنگے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھنے والے طلب علموں کی اکثریت کو نہ تو اچھا مسلمان بنانے پر کوئی توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی اچھا پاکستانی بنانے کی کوئی فکر ہے۔

سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کی تعلیم کے لیے پاکستان میں کم از کم تین علیحدہ علیحدہ نظام رائج ہیں۔ ان کے نام (1) بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن BSE اور بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن BIE - (2) کیئبرج انٹرنیشنل ایجوکیشن CIE (3) آغا خان یونیورسٹی ایجوکیشن بورڈ - AKU EB ہیں۔ روایاتی تعلیم کے ان تین بڑے نظاموں کے ساتھ مذہبی تعلیم کے لیے مدارس کا نظام پانچ مختلف اداروں کے تحت چل رہا ہے۔ ان میں وفاق المدارس العربیہ (سنی، دیوبندی)، تنظیمات المدارس (سنی، بریلوی)، وفاق المدارس الشریعہ، وفاق المدارس السلفیہ اور رابطہ المدارس

(جماعت اسلامی کے زیر انتظام) شامل ہیں۔ پاکستان کے روایتی گورنمنٹ اور پرائیویٹ اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد اڑھائی کروڑ سے زائد اور مذہبی مدارس میں تیس لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ پرائمری اسکول میں دو کروڑ پچیس لاکھ سے زائد طالب علم داخلہ لیتے ہیں لیکن سیکنڈری اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد اٹھائیس لاکھ رہ جاتی ہے۔ جامعات کی سطح تک پہنچنے والے طالب علم صرف پانچ لاکھ تک ہیں۔ کئی اسباب کی وجہ سے دنیا کے 188 ممالک کے تعلیمی اشاریے میں پاکستان مسلسل انحطاط کے ساتھ 147 ویں پوزیشن پر ہے۔ اس سے پہلے کے اشاریے میں پاکستان کی پوزیشن 146 تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پاکستان کے حکمران ملک کو اس انحطاط تک جانے ہی نہ دیتے۔ ایسا ہو بھی گیا تھا تو فوری طور پر ملک میں تعلیمی ایمر جنسی نافذ کرتے اور پاکستان کو عالمی سطح پر تعلیمی لحاظ سے کسی بہتر پوزیشن پر لانے کی کوشش کرتے۔ صد افسوس کہ سیاسی کھیل تماشوں میں مشغولیت، حکمرانی کو اپنے لیے مراعات اور پروٹوکول کا ذریعہ سمجھنے کی عادت ملک کے مستقبل کے ساتھ کوئی کمٹنٹ نہ ہونے اور تعلیم کی فراہمی میں عدم دلچسپی نے یہ دن بھی دکھادیا۔ اس انحطاط کی ذمہ داری کون قبول کرے گا؟ اکثر کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں حکومت کرنا عوام کے منتخب نمائندوں کا حق ہے۔ قانون سازی اور پالیسیاں بنانا پارلیمنٹ کا کام ہے۔ پاکستان میں پانچ سو سالہ عمر تک کے ہر لڑکے اور لڑکی کو مفت اور لازمی تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔ یہ شق بھی عوام کے منتخب کردہ نمائندوں نے آئین میں شامل کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ بعد میں عوام کی منتخب کردہ حکومت اور پارلیمنٹ اپنے فرائض پورے نہ کر میں تو کیا ہوگا؟ صرف تعلیم کے بارے میں آئین کے آرٹیکل پر عملدرآمد کرنے کا معاملہ نہیں بلکہ اردو کو سرکاری زبان بنانے، مردم شماری میں تاخیر، بلدیاتی اداروں کو مالی انتظامی خود مختاری دینے سمیت کئی نکات آئین میں دیے گئے حقوق یا ہدایات سے انحراف کی مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ اس

صورت حال میں قوم کو سیاسی، معاشی یا اخلاقی لحاظ سے جو خسارے ہوتے رہے ہیں ان کا ازالہ کیسے ہو گا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہم نے بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کا یوم پیدائش محبت اور عقیدت کے ساتھ منایا لیکن حقیقی معنوں میں قائد اعظم کی پیروی کے لیے پاکستان کی پارلیمنٹ اور منتخب حکومتوں کو اپنی غلطیوں کے اعتراف اور ان کے ازالے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس ملک میں منتخب حکومتوں کو اپنے فرائض کا احساس ہوتا ہے جہاں حکمران حقیقی معنوں میں عوام کی بھلائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس ملک میں پینے کے صاف پانی اور ہسپتالوں کی بد انتظامی نظام کی تباہی پر عدلیہ کو ایکشن نہیں لینا پڑتا۔ عوامی نمائندگی مراعات یا پروٹوکول کے حصول کے لیے نہیں بلکہ دیانت اور صداقت کے بچے جذبوں کے ساتھ قوم کی تعمیر و ترقی اور ملک کے استحکام کے لیے لازمی ہے۔ ایسا نہ ہو تو عوام پہلے اپنے نمائندوں اور پھر پورے نظام سے ہی مایوس ہونے لگتے ہیں۔

اقبال کا خواب

حضرت علامہ محمد اقبال نے ایک محبت بھرا خواب ان نوجوانوں کے بارے میں دیکھا جو خواب میں خواب میں انھیں ستاروں پر کمند ڈالتے دکھائی دیے۔ اقبال کا خواب کیا خواب ہی رہے گا؟ اگر محترم علامہ آج زندہ ہوتے تو شاید انھیں ہر جانب کرگسوں کے غول کے غول آوارہ گھومتے نظر آتے اور کہیں خال خال شاہین بچے دیواروں سے سر ٹکراتے پائے ملتے۔ خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ اب ہم منحصر ہے کہ خواب سچ کر دکھائیں یا پھر خوابوں کو خوشچال ہوتے دیکھیں۔ تیزی سے بوڑھی ہوتی ہوئی ترقی یافتہ دنیا کے مقابلے میں خیر سے عجیب الخلق ترقی (Hybrid Development) کے ہاتھوں ہمارا پیارا دیس پاکستان بہت ہی جواں ہو چلا ہے۔ نوجوان آبادی کے روز افزوں ہجوم پر ہمارے ماہرین و مفکرین بغلیں بجاتے نہیں تھکتے لیکن یہ بھولتے ہوئے کہ ان کے ساتھ کیا کیا بیت رہی ہے اور وہ کیا سے کیا بنتے جا رہے ہیں؟ ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی (جس پہ قابو پانا قدرت کے قوانین میں مداخلت کے مترادف سمجھا جانا عین ایمان ہے) کا 64 فیصد 30 برس تک کے نونہالوں پر مشتمل ہے، جبکہ 15 سے 29 برس کے نوجوان ہماری کل آبادی کا 29 فیصد ہیں۔ یعنی تقریباً ایک تہائی۔ ان پر کیا بیت رہی ہے وہ ذیل میں دیے گئے حقائق سے صاف ظاہر ہے۔ بھلے آپ کیسے ہی سروے کریں ہمارے دو تہائی سے زیادہ لوگ بشمول نوجوانان غربت کی لکیر کے فقیر ہیں۔ 84 فیصد آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ اڑھائی کروڑ بچے سکولوں سے باہر ہیں۔ آدھی سے کہیں زیادہ آبادی ناخواندہ ہے اور تقریباً 80 فیصد جائیں یا پھر جو 20 فیصد ہیں ان میں پڑھے لکھے جاہل کتنے ہیں ان کا کوئی شمار نہیں۔ 44 فیصد بچے ذہنی و جسمانی طور پر لاغر ہیں جبکہ 55 فیصد بچے غیر صحت مند اور بیروز گاروں، نیم بیروز گاروں کا جم غفیر ہے جو ستاروں پہ کمند ڈالنے کی بجائے، بے هنری، بے علمی اور بے عقلی کے ہاتھوں بے بس ولاچار ہوا جاتا

ہے۔ ایسے میں ہمارے دو جید سماجیاتی ماہرین ڈاکٹر عادل نجم اور ڈاکٹر فیصل باری نے ایک طویل عرق ریزی، ایک لاکھ تیس ہزار لوگوں تک رسائی کر کے اور نوجوانوں کی بڑی تعداد کے ساتھ مشاورت سے یہ بھید پانے کی کوشش کی ہے کہ آخر ہمارے نوجوانوں کے مشاغل کیا ہیں، انھیں کن سہولتوں تک رسائی ہے، ان کے پاس تعلیم کیا ہے، روزگار کیا ہے اور وہ اپنی زندگی کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کا جائزہ فقط 100 نوجوانوں کے حالات و کیفیات تک محدود ہے جن میں 64 فیصد شہروں اور 36 فیصد دیہات میں رہتے ہیں اور ان میں پنجابی اور اردو بولنے والوں کی اکثریت (52 فیصد) ہے۔ منفی تعداد مساوی ہے۔ ان میں 70 فیصد ناخواندہ اور 6 فیصد کے پاس بارہ سال کی تعلیم ہے۔ 20 بیروزگار 24 بے قاعدہ یا بلا معاوضہ ملازم ہیں۔ 85 کی انٹرنیٹ تک رسائی نہیں 94 نے کبھی لائبریری میں قدم نہیں رکھا۔ 93 کو سپورٹس کی سہولت میسر نہیں۔ 77 کے پاس کوئی سواری نہیں، ایک کے پاس کار اور 12 کے پاس موٹر سائیکل ہیں، 48 کے پاس فون نہیں۔ لیکن ہمت مرداں یا پھر خوش گمانی دیکھئے کہ 89 فیصد اللہ کے فضل پر خوش ہیں، 70 فیصد کے خیال میں وہ محفوظ ہیں۔ 76 اپنی زندگی کو والدین کے حالات سے بہتر مانتے ہیں اور 48 اپنے شاندار مستقبل کی امید لیے ہیں اور 36 کو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی پڑتا ہے۔ خستہ حالات زندگی کے باوجود ان نوجوانوں کی خوش گمانیوں پر رشک آتا ہے۔ یہ سب حقائق اور جائزے یو این ڈی پی کی پاکستان بارے قومی انسانی ترقی کی رپورٹ میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان نتائج پر دونوں محققین حیران و پریشان ہیں۔ مگر، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس جائزے کے مطابق کسمپرسی کے حالات کے باوجود ہمارے نوجوانوں کی اکثریت اپنے حالات اور مستقبل کے بارے میں شاداں ہے اور ایک تہائی مایوس ہوئے لگتے ہیں۔ گو کہ اس جائزے کے نتائج ناقابل یقین ہیں لیکن اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جائزہ محدود ہیں لیکن حقائق پر مبنی ہے۔ مختصر یہ کہ نوجوانوں کا پاکستان نہایت

متفرق و منقسم ہے۔ پھر بھی ان میں امیدیں اور خوش فہمیاں ہیں جنہیں بار آور بنایا جاسکتا ہے اور بنایا جانا چاہئے لیکن اگر ان میں موجود بے یقینی اور اضطراب کو نظر انداز کیا گیا (جیسا کہ ہم اس کے عادی ہیں) تو پھر سماجی دھماکے کے لیے تیار رہیے۔ ان دو ماہرین کے خیال میں پاکستان میں نوجوانوں پر سرمایہ کاری کرنے سے بہتر کوئی سرمایہ کاری نہیں۔ انھوں نے نوجوانوں پر ایسی تین سرمایہ کاریوں کا ذکر کیا ہے جن کے کرنے سے چمن میں بہاراں ہی بہاراں اور نہ کرنے سے خزاں ہی خزاں کا راج ہو سکتا ہے۔ وہ تین سرمایہ کاریاں کیا ہیں؟

اول: معیاری تعلیم۔

دوم: منفعت بخش روزگار

سوم: با مقصد سنت۔

ان تینوں کلیدی موضوعات پر رپورٹ کے مصنفین نے خوب روشنی ڈالی ہے۔ تعلیم کے حوالے سے سکولوں میں داخلے کی موجودہ ایک فیصد سالانہ بڑھوتری کی بنیاد پر 2072ء تک پاکستان کا ہر بچہ سکول جاسکے گا۔ اگر پائیدار ترقی کے اہداف (DDGS) کو سامنے رکھتے ہوئے ناخواندگی 2030ء تک ختم کرنی ہو تو سکولوں میں داخلے کی موجودہ شرح کو چار گنا کرنا ہو گا۔ جس کا سادہ سا مطلب ہے کہ تعلیم پر موجودہ دو فیصد بجٹ کو آٹھ فیصد تک بڑھانا پڑے گا اور اگر صحت کا موجودہ آدھا فیصد بجٹ رہا تو پھر بھی ممکن نہ ہو سکے گا اور صحت کے بجٹ کو بھی کم از کم چار فیصد تک بڑھانا ہو گا لیکن چالو تعلیم فقط دو لے شاہ کے چوہے پیدا کرتی ہے۔ تعلیم کو معیاری اور با مقصد بنانے کے لیے عقل و خرد اور سائنس سے رجوع کرنا ہو گا۔ ان کا دوسرا نکتہ روزگار اور بار آور روزگار کا ہے۔ پاکستان میں بڑھتے ہوئے نوجوانوں کے ہجوم کے لیے دس سے پندرہ لاکھ آسامیوں کو پیدا کرنے

کی ضرورت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن بڑا چیلنج بار آور اور مفید روزگار کا ہے اور اس کا تعلق معیشت، زراعت صنعت اور خدمات کے شعبوں کی ترقی، ترقی کے انسانی ماڈل کو اختیار کرنے اور انسانی ذرائع کی ترقی سے ہے۔ نیز تعلیم ہو یا روزگار، عورتوں کی اس میں بھرپور شمولیت کے بغیر یہ ممکن نہیں اور تیسرا نکتہ ہے کہ نوجوانوں کو با مقصد رفاقت یا شراکت مہیا کی جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کی زندگی کے تمام معاملات میں ان کی آواز سنی جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ماں باپ سنی ان سنی کرتے ہیں۔ اساتذہ بھاشن دیتے ہیں۔ علماء فتویٰ صادر کرتے ہیں۔ استاد کار میگر لتاڑتے اور مارتے ہیں اور بچیاں تو بیچاری ہر طرح کے شر کے نشانے پر ہیں اور بولنے کی اجازت نہیں۔ ہمارے بچے اور جوان روز خواب دیکھتے ہیں، جو روز ٹوٹتے ہیں اور پھر بنتے ہیں۔ نوجوانوں کی یہ فوج ظفر موج قلم و کتاب، درس و تربیت، علمیت و حریت، با مقصد اور خدمت کرنے کی طلب گار ہے۔ پاکستان کی انسانی و طبعی سلامتی کا انحصار صرف اور صرف ہمارے نوجوانوں کے جم غفیر کی با مقصد تعلیم، بار آور تربیت، صحت مند افزائش اور انسانی بالیدگی میں ہے۔ حضرت علامہ محمد اقبال تو خواب دیکھتے چلتے بنے۔ ایک محبت بھرا خواب انھوں نے ان نوجوانوں کے بارے میں بھی دیکھا جو خواب ہی خواب میں انھیں ستاروں پر کمند ڈالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کا خواب کیا خواب ہی رہے گا؟

باب نہم

سائنس اور ٹیکنالوجی

کشش ثقل لہروں کی موجودگی

ماہرینِ طبیعیات نے حال ہی میں کشش ثقل لہروں کی موجودگی کا انکشاف کیا ہے جبکہ آئن اسٹائن نے ان لہروں کی موجودگی کے بارے میں ایک صدی پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی۔ ماہرینِ فلکیات کے مطابق یہ لہریں آج سے تیرہ ارب 70 کروڑ سال پہلے ہوئے بگ بینگ (big bang) کے ظہور کے 3 لاکھ 80000 سال بعد کے ایک ایک واقعہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ کشش ثقل لہریں انفجارِ عظیم کے بعد سے اب تک پوری کائنات میں گردش کر رہی ہیں۔ تاہم یہ لہریں اس قدر نحیف ہیں کہ ان کی پیمائش موجودہ تکنیکی آلات سے اب ممکن ہوئی پہلے نہیں کی جاسکتی تھی۔ کائناتی زیرِ موجی پس منظر تابکاری (radiation cosmic microwave background) کے ذریعے اب یہ ممکن ہو گیا ہے۔ ابتدا تخلیق کائنات کے ابتدائی زمانے کے واقعات کارڈیائی دور بین کے ذریعے ان لہروں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انفجارِ عظیم کے ابتدائی لمحات میں کائنات ایک اکائی سے جڑی ہوئی تھی اور پھر ایک عظیم ترین دھماکے کے ذریعے یہ وجود میں آئی، انفجارِ عظیم کا تصور سب سے پہلے ایک (Belgium) کے سائنسدان (Georges Lemaitre) نے 1927 میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ پوری کائنات ایک اکائی کی شکل میں ایک نقطے پر مرکوز ہے اور (big bang) کے نتیجے میں کائنات کی وسعت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کے سائنسدانوں کو غالباً یہ پتہ نہیں کہ اس بات کا اشارہ قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ سترھویں س پارے کی آیت 30 میں فرماتے ہیں کہ اور کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اکائی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے پس ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔ حال ہی میں لیگو Laser Interferometer Gravitational- (LIGO) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر Wave

Observatory ڈیوڈ ریٹز David Reitz نے واشنگٹن میں پریس کانفرنس میں کشش ثقل لہروں کی موجودگی کا اعلان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ پچاس سالوں سے سائنس دان ان لہروں کی موجودگی کی کھوج میں سرگرداں تھے اور پچھلے پچیس سالوں سے ایسے حساس حالات بتانے کے لیے کوشاں تھے کہ ان لہروں کو جانچا جاسکے جن کے اشارے نہایت کمزور ہیں۔ جدید و حساس آلوں کی مدد سے ہم ان کشش کی ثقل لہروں کی پیمائش کر سکیں گے جو کہ ستاروں کے پھٹنے کے شدید عمل کے نتیجے میں یا دو ثقب اسود (black holes) کے تصادم سے جڑ کر ایک ہونے کے عمل کے دوران خارج ہوتی ہیں۔ ان لہروں کا مطالعہ کرنے کے لیے انٹارکٹک (Antarctic) کو منتخب کیا گیا کیونکہ وہاں کی ہوا خشک ہے، فضا میں پانی کے بخارات کی موجودگی زیر موج تابکاروں کے لیے رکاوٹ بنتی ہے اور جانچ کے عمل کو مشکل بناتی ہے۔ اس لیے South Pole Station Amundsen-Scott میں اس کا مطالعہ کیا گیا جو کہ انٹارکٹک کی 2800 میٹر کی بریفلی تہہ پر محیط ہے جہاں کوئی آبادی نہیں ہے لہذا کسی قسم کے موبائل فونز، ٹیلی ویژن اور دیگر برقی آلات کے سنگنل موجود نہیں ہیں جو ان لہروں کو پہچاننے میں دشواریاں پیدا کر سکیں۔ بیسویں صدی کے اوائل تک وقت اور خلا کا آپس میں کوئی ربا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ خلا میں کسی بھی جگہ کی وضاحت تین مخصوص جسامتوں کی ناپ یعنی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی سے ظاہر کی جاتی تھی اور وقت کو علیحدہ چوتھی جسامت سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں آئن اسٹائن نے انداز ہلگایا کہ وقت اور جگہ ایک ہی زاویے کے دو پہلو ہیں اور ان میں آپس میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ مثال ہونے والے واقعات کسی جگہ رونما ہونے کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اگر آپ کے پاس زمین پر جوہری گھڑی ہو ایک ایسی ہی گھڑی ایک خلائی شٹل (جو کہ بڑی تیزی سے زمین کے گرد گھوم رہا ہے) میں بھی موجود ہو اور دونوں گھڑیوں پر سے وقت کا موازنہ کیا جائے تو خلائی شٹل میں وقت زمین والی جوہری گھڑی سے نسبتاً

زیادہ سستی سے گزرے گا۔ دوسرے معنوں میں وقت کا گزر رفتار پر بھی مختصر ہے اس کا اندازہ وہ شخص بخوبی لگا سکتا ہے جو روشنی کی رفتار کے قریب رفتار سے چند گھنٹوں کے لیے سفر کرے تو اس کے دوچند گھنٹے دنیا میں صدیوں کے برابر ہوں گے اور جب وہ زمین میں واپس آئے گا تو صدیاں گزرنے کے بعد ایک نئے زمانے میں ہوگا۔ لہذا آئن اسٹائن کے اس اصول کی تصدیق کرتا ہے کہ وقت بڑی تیزی سے سست ہوتا ہے۔

آئن اسٹائن کے عمومی اضافیت کے اصول کے مطابق کسی بھی وزن کی وجہ سے کشش ثقل وقت اور خلا کی حالت کو مسخ کر سکتی ہے اور خلائی وقت کا پردہ اس وزن کی وجہ سے اس جگہ سے ٹیڑھا ہو سکتا ہے۔ آئن اسٹائن کے مطابق اس طرح خلائی وقت کا ٹیڑھا میڑھا ہونا کشش ثقل کی لہروں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور پھر یہ لہریں پوری کائنات میں پھیل جاتی ہیں۔ یہ لہریں خلاء میں روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ اگر آپ کو کبھی کشش ثقل کی لہروں کو دیکھنے کا موقع ملے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے یہ لہریں باری باری اوپر نیچے اور دائیں سے بائیں سمتوں میں سکڑ اور پھیل رہی ہیں۔ کیلی فورنیا ادارہ برائے تکنیکی تعلیم کے پروفیسر کپ تھورن کے مطابق اب تک ماہرین فلکیات کائنات میں خلا کو ایک پرسکون سمندر سمجھتے تھے لیکن اب حالیہ مشاہدات نے یہ نظریہ بالکل بدل دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ثقب اسود (Black holes) کے تصادم سے ابھرنے والی کشش ثقل کی لہروں نے خلا اور وقت کے پردے میں ایک سنگین طوفان کی صورت حال اختیار کر لی ہے، ایسا طوفان جس میں وقت تیز اور کم ہوتا ہے، پھر تیز ہو جاتا ہے، ایسا طوفان جس میں خلا کبھی اس طرح طرف جھکتی ہے تو کبھی اس طرف پھیلتی ہے۔

جامعہ برمنگھم کے پروفیسر البرٹو ویچچو کے مطابق، ہم نے اب تک کائنات کا روشنی کے ذریعے مشاہدہ کیا ہے لیکن ہم صرف وہ حصہ دیکھ سکتے ہیں جو کائنات میں موجود ہے۔ کشش کی نقل لہروں میں کائنات کے عوامل کی بالکل ہی مختلف معلومات ہوتی ہیں۔ لہذا اب ان لہروں تک پہنچ کر ہم نے ایک نیا چینل کھول لیا ہے جو ہمیں ان عوامل سے آگاہی دے گا جن سے ہم بالکل نا آشنا ہیں، وہ مزید کہتے ہیں، یہ مشاہدہ واقعی حیرت انگیز سائنس ہے اور علم طبعیات میں تین سنگ میل تک رسائی کی نشاندہی کرتا ہے، براہ راست کشش ثقل کی لہروں کا کھوج، الگ نوعیت کے black holes کی حقیقت اور سب سے حیرت انگیز یہ کہ انقباض اسود کی موجودگی کا ثبوت جس کی موجودگی کے بارے میں آئن اسٹائن نے گزشتہ صدی ہی میں آگاہ کر دیا تھا۔ یہ دریافت نہایت حیرت انگیز ہے کہ سائنسدان اور ماہرین فلکیات بلیک ہول کے ملاپ کا کھوج لگانے اور اس کے نتیجے میں شدید طاقتور توانائی کے اخراج کو اس حساس آلے کے ذریعے دیکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ آلہ اس قدر حساس ہے کہ چار نوری سال کے فاصلے پر نظام شمسی کے ستارے میں باریک سے باریک تبدیلیوں خواہ وہ انسانی بال کی موٹائی تک کی ہی کیوں نہ ہوں بڑی درستگی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمارے پاس ایسے آلات ہیں جن سے بلیک ہول کے فوراً بعد کے واقعات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک بہت بڑا اسرار یہ ہے کہ کہکتا میں جن میں تمام ستارے، سیارے اور انقباض اسود موجود ہیں وہ صرف پوری کائنات کا پانچ فیصد وزن ہیں باقی 95 فیصد کا (mass) کہاں سے آتا ہے، یہ بہت بڑا راز ہے اسے سیاہ توانائی اور سیاہ وزن کہتے ہیں ہیں۔ کشش ثقل کی لہریں شاید ایک دن راز افشا کریں گی کہ کیوں کائنات کا بیشتر حصہ پوشیدہ ہے اور اس کے پیچھے کون سے حقائق ہیں، یہ ہمیں پتہ نہیں۔

سپر ہیومن کی تیاری

خود کو ناقابلِ تسخیر بنانے اور موت کے پنجوں سے محفوظ رکھنے کی انسان کی خواہش بہت پرانی ہے۔ اس کے لیے کبھی اس نے آبِ حیات تلاش کرنے اور بنانے کی کوشش کی تو کبھی خلا میں جا کر طرح طرح کے تجربات کیے، مگر تاحال وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس کی کوشش جاری ہے۔ ان ہی کوششوں کے ایک عمر کے طور پر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی دنیا کی معروف کمپنی گوگل کے ماہرین کی جانب سے نومبر 2016ء میں یہ دعویٰ سامنے آیا تھا کہ 2029ء میں انسان سپر ہیومن بن جائیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹیکنالوجی اگلے بارہ برسوں میں انسانوں کو سپر ہیومن بنا دے گی جو زیادہ طاقت ور، چست و چالاک، خوب رو اور صحت مند ہوں گے۔ 2029ء تک ہمارے دماغ مشینوں کے ساتھ فیوز ہو جائیں گے جس کی وجہ سے ہماری دماغی کارکردگی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ماہرین کے مطابق ٹیکنالوجی پہلے ہی انسانوں پر کافی حد تک اثر انداز ہو چکی ہے، جس کی واضح مثال ہماری موبائل فون کی علت یا نشہ ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہمارے دماغ اور جسم میں کمپیوٹر نصب ہوں گے جو ہمیں زیادہ سمارٹ، چالاک اور خوب رو بنائیں گے۔ تحقیق میں شامل ایک ماہر، کروزیل، جو گوگل لرننگ مشین پر وجیکٹ پر کام کر رہے ہیں، ان کی پیش گوئیاں 86 فیصد تک درست ثابت ہو چکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 2029ء تک کمپیوٹر انسانوں کے برابر ذہین ہو جائیں گے اور انھیں انسانی دماغ میں فٹ کرنے سے موجودہ وقت کے انسان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ سمارٹ، مضبوط، ذہین اور خوب رو افراد وجود میں آجائیں گے۔ گوگل کے ماہرین کے مطابق وہ اس ضمن میں پہلے ہی تجربات شروع کر چکے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ 2029ء تک وہ انسانوں کو سپر ہیومن میں تبدیل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ماہرین کے مطابق جس تیزی سے مصنوعی

ذہانت (آرٹیفیشل انیلی جنس) کے شعبے میں ترقی ہو رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ 20 برسوں میں انجیکشن کے ذریعے

بہت چھوٹی مشینیں جسم کے ساتھ جوڑ کر انسانوں کو زبردست طاقت مہیا کی جاسکے گی، جس سے وہ سپر ہیومن بن جائیں گے۔ مصنوعی ذہانت کی مشینیں جنہیں نینو مشینز کہا جاتا ہے، ایسے ہی جسم کے ساتھ جوڑی جائیں گی جیسے موجودہ دور میں جسم میں مختلف امپلانٹس کیسے جاتے ہیں۔ اس وقت انسان ہاتھ کے اشاروں سے مختلف آلات کو کنٹرول کر سکے گا۔

بعض ماہرین نے سپر ہیومنز کے لیے سائی بورگ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آئی بی ایم کے ہر سلی انویشن سینٹر کے سینئر موجد، جان میک نمارا کے مطابق ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسی انسانی نسل پیدا ہوگی جسے آدھا انسان اور آدھی مشین کہا جاسکتا ہے۔ دودھائیوں میں ہونے والی ترقی انسان کو شعور اور آگہی کی بلندیوں پر لے جائے گی۔ ان کے مطابق نینو مشینیں انسانی جسم کے ساتھ جوڑے جانے سے کئی طرح کے طبی فوائد بھی حاصل ہو سکیں گئے۔ مثلاً خلیوں، بافتوں اور ہڈیوں کو پہنچنے والے نقصانات کا اثر بہت کم یا ختم کیا جاسکے گا اور انھیں ایسا بنایا جاسکے گا کہ ان میں آئندہ کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکے۔ ہم اپنے ارد گرد موجود مختلف آلات اشاروں اور خیالات کی مدد سے کنٹرول کر سکیں گے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ مشینوں کی جسم میں موجودگی انسانوں کو سوچنے، سمجھنے اور حسابات کرنے میں زبردست مدد فراہم کرے گی، تاہم میک نمارا نے خبردار کیا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی شاید صرف امیر افراد ہی استعمال کر سکیں گے اور دیگر لوگوں کے مقابلے میں وہ زیادہ طاقت در صحت مند اور زیادہ آگہی رکھنے والے ہوں گے۔

دوسری جانب کیلی فورنیا، امریکا سے یہ خبر آچکی ہے کہ یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا کے بائیو میڈیکل انجینئر نے ایسی دماغی چپ تیار کر لی ہے جو انسان کے دماغ میں لگائی جاسکے گی، جس سے اس کی یادداشت میں زبردست اضافہ ہو جائے گا اور یوں وہ شخص وہ سپر ہیومن بن جائے گا۔ یہ چپ الیکٹریکل سگنل دے گی، جس سے انسان کی یادداشت برسوں تک برقرار رہے گی۔ اطلاعات کے مطابق اس وقت فالج کے مریضوں پر اس چپ کے تجربات کیے جا رہے ہیں لیکن مستقبل میں یہ چپ تجارتی طور پر دستیاب ہوگی اور کوئی بھی شخص اپنی یادداشت میں اضافے کے لیے اسے اپنے دماغ میں نصب کرا سکے گا۔ اگرچہ اس وقت یہ منصوبہ کسی سائنس فکشن فلم کی مانند محسوس ہوتا ہے لیکن ماہرین کو امید ہے کہ جلد ہی ری ایسی چپ عام ہو جائے گی۔

اطلاعات کے مطابق اس چپ کو کامیابی کے ساتھ بندروں اور چوہوں کے دماغ میں نصب کر کے تجربات کیے جا چکے ہیں۔ واضح رہے کہ مینٹل انجینئر اس پر 20 سال تک کام کرتے رہے تھے۔ اس چپ اور اس کے لیے بنائے گئے سافٹ ویئر سے ایسے افراد کو بہت فائدہ ہو گا جنہیں بھولنے کی عادت ہے۔ یہ چپ تیار کرنے والے ادارے کو امید ہے کہ اس سے الزائمر کے مریضوں کو بھی فائدہ ہو گا۔ ایکس مین حقیقت بن جائے گا؟

اگر آپ ایکس مین سیریز کے دیوانے ہیں تو آپ ان فلموں کے اہم کردار وولورین کی پر اسرار صلاحیتوں سے بھی واقف ہوں گے، جو اس کا زخم از خود ٹھیک کر دیتی ہیں۔ خواہ وہ زخم گولی کی وجہ سے لگا ہو یا وہ خنجر کے وار کا نتیجہ ہوں۔ وولورین کا پر اسرار جسمانی نظام زخم لگتے ہیں اسے مندل کرنے کے لیے متحرک ہو جاتا ہے اور دیگر اعضا کی کارکردگی بڑھا دیتا ہے۔ وولورین کی ان ہی خصوصیات کو حقیقت کو روپ دینے کے لیے تحقیق اور تجربات کیے جا رہے ہیں۔ امریکی محققین ایسا

امپلانٹ یا انسانی جسم میں لگایا جانے والا آلہ بنانے کے لیے تحقیق میں مصروف ہیں جو انسانوں میں اس کردار جیسی صلاحیت پیدا کر دے گا۔

اس پروجیکٹ کو انھی نے الیکٹرکس (ElectRx) کا نام دیا ہے۔ اس میں جسم کے اندر ایسے چھوٹے آلات داخل کیے جائیں گے، جو برقی اشاروں کے ذریعے اعضاء کی کارکردگی پر نظر رکھیں گے اور کسی جسمانی نقصان کی صورت میں ان کی کارکردگی بڑھانے کا کام کریں گے۔ اس پراجیکٹ کے لیے فنڈز ڈیفنس ایڈوانسڈ ریسرچ پروجیکٹس ایجنسی (DARPA) کی جانب سے فراہم کیے جا رہے ہیں جو امریکی محکمہ دفاع کا ذیلی ادارہ ہے اور عسکری ایجادات کا ذمہ دار ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ الیکٹرکس کا ہدف امریکی فوجیوں کو سپر ہیومن بنا کر میدان جنگ میں اتارنا ہے، تاکہ جانی نقصان سے محفوظ رہتے ہوئے فتح حاصل کی جاسکے۔ اس پروجیکٹ کے تحت بنائے گئے امپلانٹ اتنے مختصر ہوں گے کہ انھیں سوئی کے ذریعے جسم میں داخل کیا جاسکے گا۔ جسم میں داخل ہونے کے بعد یہ ننھے آلات برقی اشاروں کے ذریعے اعضا کی نگرانی کریں گے۔ اعضا کے زخمی یا متاثر ہونے کی صورت میں یہ آلات ان اعصاب کو متحرک کر دیں گے جو ان کے افعال کنٹرول کرتے ہیں اور وہ اس زخم کو مندرجہ ذیل کرنے کا کام شروع کر دیں گے۔

ان ننھے آلات کی تیاری کا تصور ہمارے جسم کے نگرانی کے مخصوص نظام سے لیا گیا ہے جسے نیوروماڈیولیشن کہتے ہیں۔ اعصابی نظام میں نیوروماڈیولیشن دراصل اعضا کی حالت اور مختلف امراض لاحق ہونے کی صورت میں ان کا طرز عمل مانیٹر کرتا ہے، مگر انسان کے بیمار یا زخمی ہو جانے کی صورت میں یہ کمزور ہو جاتا ہے اور تیزی سے کام نہیں کر پاتا۔ مجوزہ امپلانٹ اس قدرتی عمل کو مہمیز دینے کا باعث بنے گا، جس کے نتیجے میں متاثرہ اعضا کے

صحت مند ہونے کا عمل تیز ہو جائے گا۔ اس کام کے لیے اگرچہ نیوروماڈیولیشن ڈیوائس موجود ہیں، مگر وہ اتنے بڑے ہیں کہ انھیں انسانی جسم میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کوئی سازشی نظریہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ کافی عرصے سے امریکا اور روس سپر ہیومن بنانے کی دوڑ میں مصروف ہیں، تاکہ انھیں فوج میں بھرتی کر کے اپنی افواج کو ناقابلِ تسخیر بنا سکیں۔ ان کا یہ خواب تو نہ جانے کب تعبیر ہوگا، لیکن امریکی سائنس دانوں نے اپنے فوجیوں

کے جسم اور دماغ تیز ترین بنانے کے لیے ایک مشروب تیار کر لیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس مشروب کا نام کیٹو ان اے بوٹل ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے ایک دہائی کی تحقیق کے بعد تیار کیا ہے اور سان فرانسسکو کی ایک کمپنی نیاس کی وسیع پیمانے پر تیاری شروع کر دی ہے۔

یہ مشروب خالص کیٹون ایسٹر (Ketone Ester) سے تیار کیا گیا ہے جسے پینے سے انسانی جسم میں توانائی بھر جاتی ہے اور اس کی چربی تیزی سے پگھلنے لگتی ہے اور اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس کی 28 گرام خوراک میں 160 کیلوریز ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ لگ بھگ اتنی ہی کیلوریز ایک بڑے سائز کے کیلے میں ہوتی ہیں، لیکن اس میں چکنائی، پروٹین اور کاربوہائیڈریٹ نہیں ہوتے۔ ماہرین کے مطابق جب ہم کاربوہائیڈریٹس کی حامل خوراک کم لینا شروع کرتے ہیں تو ہمارا جسم کیٹوسز (Ketosis) پر منتقل ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں جسم میں جمع شدہ چربی ٹوٹ کر کیٹونز میں تبدیل ہو جاتی ہے جو ہمارے پٹھوں اور دماغ کو توانائی دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں آدمی کا وزن تیزی سے کم ہونے لگتا ہے۔ یہ مشروب بالکل اسی طرح سے کام کرتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ کاربوہائیڈریٹس کی حامل خوراک سے پرہیز کرنا لازمی نہیں ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کی سائیکالوجیکل بائیو کیمسٹری کی پروفیسر کیرن کلارک کے مطابق پیزا اور کاربوہائیڈریٹس کی حامل دیگر اشیائے خور و نوش کے ساتھ اس مشروب کا استعمال انسانی جسم کی کارکردگی بڑھاتا ہے اور چربی کم کرتا ہے۔ ان کے بقول اس سے قبل ہمارے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جو یہ کام کر سکتی۔

نینو ٹیکنالوجی کا فروغ

ٹیکنالوجی اور انسان کا ساتھ دنیا کی ابتدا سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابتدا اور آج کی ٹیکنالوجی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انسان نے درخت و دیگر اشیاء کو کاٹنے کے لیے کلہاڑی اور دیگر اوزار تیار کیے جو انسان کی بنائی ہوئی ابتدائی ٹیکنالوجی تھی۔ آج دنیا جدید سے جدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی نے نہایت تیزی سے ترقی کی ہے اور نئی نئی اشیاء انسان کو مہیا کر دی ہیں۔ انسان کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے گھر بیٹھے ہزاروں سہولتیں استعمال کر رہا ہے اور بہت سی مشینوں کی وجہ سے بہت سے کام منٹوں میں اور بعض صرف ایک اشارے سے ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں تیزی سے مقبول ہونے والی ٹیکنالوجی نینو ٹیکنالوجی ہے۔ چند برسوں میں اس ٹیکنالوجی نے جس رفتار سے ترقی کی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مستقبل میں کیا روپ دھارے گی۔ نینو ٹیکنالوجی مادے کی نینو اسکیل پر جوڑ توڑ کو کہتے ہیں۔ نینو سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو سوئی کی نوک سے تقریباً ایک ملین گنا چھوٹے ہوتی ہیں۔ اگر ہم تین یا چار ٹمبز کو ایک قطار میں رکھ کر اس قطار کی لمبائی نائیں تو وہ ایک میٹر کا ایک اربواں حصہ ہوگی جسے ہم نینو میٹر کہتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم ایسی مادی اشیاء ایجاد کریں جن میں ایٹم کو ایک مقررہ جگہ پر نصب کریں تو درحقیقت یہ ہی نینو ٹیکنالوجی ہے۔ اس کا مطلب ایسی ایجاد کرنا ہے جس کے کام کرنے کے لیے ہر ایٹم کا ہر دفعہ اس مقررہ جگہ پر موجود ہونا ضروری ہے۔ اس کاری گری کا نام نینو ٹیکنالوجی ہے۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوں گی ممکن ہے ان میں سے بہت سی نینو ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہوں گی۔ چند برسوں میں نینو ٹیکنالوجی نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی ہے اس سے صاف ظاہر تھا کہ بیسیویں

صدی کے آخر میں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے جو بڑا انقلاب پیدا کیا تھا، اکیسویں صدی میں نینو ٹیکنالوجی اس سے بڑا انقلاب لائے گی۔ ایسا انقلاب جو ہر صنعت اور زندگی کے ہر شعبے کو ایک نئی جہت عطا کرے گا۔ نینو ٹیکنالوجی کا حال یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہر ٹیکنالوجی بدل سکتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی کا مستقبل بہت ہی روشن مانا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود یہ سوال اٹھنے لگا ہے کہ اس کی مدد سے بنی ہوئی اشیاء کتنی محفوظ ہوں گی۔ کئی خاص تحقیقوں اور مختلف ملکوں میں تیار کی جانے والی رپورٹس میں اس کے حفاظتی پہلوؤں پر شک ظاہر کیا گیا ہے۔ ماہرین کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ آئی ٹی کی طرح نینو ٹیکنالوجی بھی دنیا بھر میں سرکاری کنٹرول سے دور ہو رہی ہے۔ لیکن اب اس پر کچھ قوانین لاگو کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے لوگوں کی صحت اور ماحول کو بھاری نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی میں استعمال ہونے والا خام مال دراصل وہ ساری اشیاء ہیں جو جانداروں اور بے جان اشیاء کی پیدائش میں خاص بلڈنگ بلاک یا مکان میں استعمال ہونے والی اینٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نینو میں مادے کا استعمال بہت ہی چھوٹی سطح پر ہوتا ہے۔ ایک نینو میٹر ایک میٹر کا اربواں حصہ ہوتا ہے۔ یعنی ہائیڈروجن کے دس ایٹم ایک کے بعد ایک جوڑ دیں تو وہ ایک نینو میٹر ہو گا۔ ایک ڈی این اے مالیکیول ڈھائی نینو میٹر کا ہوتا ہے۔ خون کا ایک خلیہ پانچ ہزار نینو میٹر کا ہوتا ہے اور انسان کے ایک بال کی موٹائی 80 ہزار نینو میٹر ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نیو انجینئرنگ میں کس طرح انتہائی چھوٹی سطح پر کام ہوتا ہے۔ نینو میں ناصر ف مادے کا انتہائی چھوٹا سائز ہوتا ہے بلکہ اس کی صفات بھی بدل جاتی ہیں۔ تانبے کو نینو کے درجے پر لانے پر وہ اتنا چمک دار ہو جاتا ہے کمرے کے درجہ حرارت پر ہی اسے کھینچ کر عام تانبے کے مقابلے میں پچاس گنا لمبا تار بنایا جاسکتا ہے۔ نینو کے درجے پر سیدھی سادی اور بے ضرر اشیا بھی بہت زہریلی ہو سکتی ہیں۔ اس کے ذریعے جاندار خلیوں اور مادوں کو بے جان ایٹمز کے ساتھ جوڑ کر کئی اشیاء بنائی جا رہی

ہیں۔ آج اس ٹیکنالوجی سے تیار شدہ سامان بازار میں آنے لگا ہے۔ چائے، کافی اور کھانے پینے کی اشیاء کے گرنے سے پڑنے والے داغ نہ قبول کرنے والے کپڑے اور دوا سے لے کر سنگھار اور فیشن کے لیے استعمال ہونے والی اشیاء بھی اس ٹیکنالوجی کی مدد سے بننے لگی ہیں۔

ان حالات میں ماہرین کی جانب سے یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس طرح سے بنی ادویہ یا کریم جسم کے خلیوں میں گھس کر انھیں تھس تھس کر سکتی ہیں۔ ڈی این اے کو نقصان پہنچا سکتی ہے یا بلڈ برین بیرئیر کو ختم کر سکتی ہے۔ تاہم دماغ اور خون کے درمیان موجود اس نازک کی سرحد کو پار کرنا ادویات کے لیے مشکل ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء اور ادویات میں اس ٹیکنالوجی کا استعمال ہونے پر جہاں بہت سے افراد خوش ہیں، وہیں سائنسدانوں اور ماہرین ماحولیات کو فکر ہو رہی ہے۔ ماہرین نے انتباہ کیا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی جتنی زیادہ طاقت ور ہوتی جائے گی، انسانی معاشرے پر اس کے اثرات بھی اتنے ہی ہمہ گیر ہوتے جائیں گے۔ اسٹین فورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال سیلو کہتے ہیں کہ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم نینو ٹیکنالوجی کے استعمال کے بارے میں پالیسیاں وضع کریں۔ ان کا خیال ہے کہ پچاس برسوں میں ہمیں ایٹم بم اور ایٹمی ٹیکنالوجی سے جو سبق ملے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ہم نے پہلے ایٹم بم بنایا اور پھر ضابطے بنائے تاکہ لوگ اندھا دھند بم برسانا شروع نہ کر دیں۔ ہم اب بھی نہیں جانتے کہ اس کہانی کا اختتام کہاں ہو گا۔ نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو گا۔ لیکن یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود نینو ٹیکنالوجی کو اہمیت دی جا رہی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس ٹیکنالوجی کے نقصانات کے مقابلے میں فائدے زیادہ ہیں۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ نینو یا بہت ہی چھوٹی اشیاء کی ٹیکنالوجی کے صحیح استعمال کے لیے نئے قوانین بنانا ضروری ہو گیا ہے۔ نینو سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو سوئی کی نوک سے تقریباً ایک ملین گنا چھوٹی ہوتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آنے والے برسوں میں اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسانی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آجائیں گی۔ ماہرین کا

خیال ہے کہ صرف چند برس بعد تین دن میں ختم ہو جانے والی بیٹریز پر لوگ ہنسیں گے، کیونکہ نینو ٹیکنالوجی کی وجہ سے کئی سال تک چلنے والی بیٹریز بنائی جا چکی ہوں گی۔

امریکا کی ایم آئی ٹی یونیورسٹی میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چند برسوں میں نینو ٹیکنالوجی کے ذریعے امریکی فوجیوں کے لیے سامان ایک سے دوسری جگہ پہنچانا آسان ہو جائے گا۔ جہاں اس وقت ایک فوجی کو 10 یا 15 کلو گرام کا بوجھ اٹھا کر چلنا پڑتا ہے، وہاں چند برس بعد یہ صرف 10 یا 15 گرام ہو جائے گا۔ رائل سوسائٹی اینڈ رائل اکیڈمی آف انجینئرنگ کی ایک رپورٹ کے مطابق نینو ٹیکنالوجی سے انسانیت کو بہت فائدے ہو سکتے ہیں۔ تاہم رپورٹ میں اس بات کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ اس کے کچھ مضر اثرات بھی ہو سکتے ہیں، خاص طور پر بہت ہی چھوٹی اشیاء یا نینو ٹیوب پارٹیکلز جو سانس لیتے وقت انسان کے جسم میں جاسکتے ہیں۔ نینو ٹیکنالوجی کے ذریعے جو ہروں اور سالموں کو استعمال کر کے مختلف اشیاء کو غیر معمولی کردار دیے جاسکتے ہیں۔

یاد رہے کہ تین چار برس قبل برطانیہ کے ولی عہد پرنس چارلس نے بھی نینو ٹیکنالوجی کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ رائل سوسائٹی اینڈ رائل اکیڈمی آف انجینئرنگ کی رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ نینو پارٹیکلز اور نینو ٹیوبز کو برطانوی اور یورپی قوانین کے تحت نئی کیمیائی اشیاء کا درجہ دیا جانا چاہئے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان نہایت ہی چھوٹی اشیاء کو روزمرہ استعمال کی اشیاء میں شامل کرنے سے پہلے آزادانہ سانس کی حفاظتی کمیٹی سے ان کی تصدیق ہونی چاہئے۔ اس رپورٹ میں نینو ٹیکنالوجی سے ماحولیات، انسانی صحت اور حفاظت پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس ٹیکنالوجی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ طبی اور صنعتی تحقیق کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوں

گے۔ ان کا کہنا ہے کہ نہایت ہی چھوٹے درجے پر اشیاء کے غیر معمولی کردار کو بہتر مشینیں بنانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ترقی کا آسان راستہ

روزنامہ آواز 270 نومبر 2011ء، ص 4

ملک کے طول و عرض میں اس وقت ایک شور و غوغا ہے کہ انقلاب اب آیا کہ جب آیا۔ اس کی ایک وجہ 2013ء کے الیکشن ہیں۔ پاکستان کی روایات کے مطابق ہر جماعت کی خواہش ہوتی ہے کہ بجائے ووٹ کے کسی تحریک کے ذریعے حکومت کو بے دخل کر دیا جائے۔ اس قسم کی حکومت مخالف تحریکوں کا ایندھن ہمیشہ سے نوجوان ہی ہوتے ہیں۔ کراچی، لاہور، پشاور، فیصل آباد کی سڑکوں پر لوئر اور مڈل کلاس کے بچے لکھے نوجوان ان تحریکوں میں آپ نے اکثر دیکھے ہوں گے۔ اس کو آج کی اصطلاح میں سول سوسائٹی کا پریشر بھی کہا جاتا ہے۔ تبدیلیوں کی ان تحریکوں کا نتیجہ پاکستان میں ہم گزشتہ 64 برس سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیشہ اقتدار انھی پارٹیوں کو ملتا ہے، وہی طاقتور جاگیردار اور سردار خاندان اسمبلیوں میں ہماری تقدیر کے فیصلے کے لیے پھر آ موجود ہوتے ہیں۔

ملک اس وقت بدترین معاشی صورت حال سے دوچار ہے۔ قرضوں میں جبری معیشت تیزی سے روبہ زوال ہے۔ انرجی کرائسس سے کمر توڑ مہنگائی تک نے عوام کو کچھ کہنے سننے کے قابل ہی نہیں چھوڑا لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ تمام پارٹیاں جو اقتدار میں ہیں، اپنی ہی حکومتوں کے خلاف انقلاب کے نعرے بلند کر رہی ہیں۔ روز کبھی مصری، کبھی لیبیائی طرز کی تبدیلیوں کی نوید سنائی جا رہی ہے۔ طاقت میں رہنے کے باوجود اقتدار کی مسند پر سوار، آج تک یہ مسائل حل نہیں کر پارہے تو 2013ء میں ایسا کون سا چراغ ان کے ہاتھ لگ جائے گا جو دنوں میں پاکستان کو ترقی کی منزلوں پر پہنچا دے گا۔ عوام کو حسب معمول بیوقوف بنانے کے لیے کبھی یہ امریکا کی ڈکٹیشن کارونا

روتے ہیں، کبھی بین الاقوامی امدادی اداروں کو قصور وار گردانتے ہیں، کبھی اپنی اندرونی سیاست کے لئے لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس امر پر مصر ہیں کہ انھی کے پاس وہ فعل موجود ہے جو آئندہ اقتدار میں آکر وہ استعمال کریں گے اور عوامی حالات میں جادوئی تبدیلی آجائے گی۔

2008ء کے مقابلے میں آج قیمتیں 80 فیصد بڑھ چکی ہیں۔ چینی جو 39 روپے کلو تھی وہ آج 80 روپے سے اوپر ہے۔ آٹا 25 سے 35، دالیں 75 سے 130 روپے، ایک کلو دودھ 32 سے 60 روپے، پٹرول 45 سے 90 روپے لیٹر، ادویات کی قیمتیں دگنی اور ڈالر 60 روپے سے 90 روپے تک پہنچ گیا ہے۔ کیا یہی وہ انقلاب تھا جس کے آنے کی نوید تین برس قبل دی گئی تھی؟

لیکن کمال ہے پاکستانی قوم کا جس کے لیڈر بھی وہی ہیں اور اہل دانش اور تجربہ نگار بھی وہی ہیں۔ کیا ایسے میں امید کی کوئی کرن ہے؟ پاکستان کی معاشی حالت صرف کھلاڑیوں اور ایکٹروں اور گانے والوں کے بھاشنوں سے بدلے گی یا کچھ اور اس کا نصیب ہو گا؟ پاکستان اور پاکستانی قوم کی خوش قسمتی ہے کہ دیر ہوتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔ ان پر ان کی حماقتوں اور غلامیوں کا خمیازہ آیا ہے لیکن عذاب نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان آج جو ان ہے، بلکہ نوجوان کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔ آسان الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ 10 کروڑ سے زیادہ پاکستانی آبادی 25 سال سے کم عمر ہے۔ اس طرح ہمارے پاس غیر معمولی انرجی کی شکل میں انتھک کام کرنے والے نوجوانوں کی ایک لامتناہی فورس موجود ہے جو ملکی آبادی کا 60 فیصد سے بھی زیادہ ہے لیکن اس میں ہمیں کسی لمحے بھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ نوجوانوں سے مراد لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہیں اور یہ بھی کہ 51 فیصد آبادی خواتین پر مشتمل ہے، اس لیے اگر اس غیر معمولی انرجی فورس کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہے تو جس کی کسی بھی تفریق کے بغیر استعمال کرنا ہو گا۔ ملائیشیا جو مشرقی ایشیا کا ایک ترقی یافتہ

مسلم ملک ہے، یہ تجربہ مہاتیر محمد کی زیر قیادت کامیاب ہوتے ہم نے 1980ء سے 2001ء تک اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ملائیشیا کی ماڈل کا معجزہ انھیں کے مرہون منت ہے، جسے دیکھ کر پاکستانی اور ایک دنیا حیرت سے آنکھیں پھاڑتی ہے لیکن یہ ایک دن، ایک مہینے یا ایک سال میں نہیں ہوا، بلکہ تین سال کی مسلسل کاوشوں سے سامنے آیا۔ پاکستان کا دوسرا مضبوط نقطہ یہ ہے کہ جوانوں اور نوجوانوں پر مشتمل پاکستانی مڈل کلاس تقریباً آبادی کا بیس فیصد یعنی 18 کروڑ میں سے تقریباً دو کروڑ ہے۔ اگر اپنے خطے پر نظر ڈالی جائے تو یہ بھارت کی 40 کروڑ اور چین کی 40 تا 60 کروڑ مڈل کلاس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، یہ دونوں ممالک پڑھی لکھی ٹیکنالوجی سے آراستہ مڈل کلاس کی بدولت آج دنیا کی دوسری اور پانچویں بڑی معیشتیں ہو گئی ہیں۔ لیکن اہم مطالعہ یہ ہے کہ یہ پڑھی لکھی مڈل کلاس ان شہروں میں طاقت رکھتی ہے اور اپنا اثر دکھا سکتی ہے جو پاکستان میں تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں۔ مناسب ہو گا کہ ہم یہاں مڈل کلاس کی تعریف بھی کرتے چلیں۔ مڈل کلاس غریبوں اور امیروں کے درمیان کی کلاس ہے جو درمیانے درجے کے کاروبار یا مناسب ملازمتوں پر انحصار کرتی ہے۔ گو پاکستان میں مڈل کلاس کی معاشی مضبوطی کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں کہ ورلڈ بینک کے مطابق دو ڈالر یومیہ سے زیادہ کی آمدنی رکھنے والے کو مڈل کلاس میں شامل کر لیا گیا، غالباً یہ 2000ء کے اوائل میں تو صحیح تھا لیکن آج کی ہوشربا مہنگائی میں یہ کچھ زیادہ خوش فہمی کہی جاسکتی ہے۔ آج کل کی جدید معیشتوں میں یہی پڑھی لکھی مڈل کلاس کسی ملک کے استحکام اور ترقی میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی مضبوطی پر ملکی مضبوطی کا انحصار ہوتا ہے۔ اصل میں بہت امیر اور بہت غریب اپنے درمیان کے بے پناہ فرق کی وجہ سے ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ پاکستان جیسے جاگیر دار معاشرے میں تو یہ امیری غریبی، حاکم و محکومی آقا اور غلامی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

واضح رہے کہ مڈل کلاس پر جمہوریت کی عمارت کھڑی رہتی ہے کہ انھی کے ذہن میں عوام کے لیے عوام کی حکومت کا صحیح تصور ہوتا ہے کہ یہ خود اس کے سب سے پہلے داعی ہوتے ہیں۔ مڈل کلاس عموماً شہروں کی پیداوار ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے نکلنے والے نوجوان اس کے معمار ہوتے ہیں۔ یہی صنعتیں چلاتے ہیں، یہی انتظامیہ کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہی حکومت کی مشینری کا پرزہ، یہی پولیس فورس، یہی فوج اور یہی مسیحا اور معمار۔

2000 سے 2008، تک پاکستان میں سات فیصد گروتھ سے زیادہ کی ترقی نے ایک مناسب مڈل کلاس کی بنیاد ڈال دی ہے۔ ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق ان سالوں میں دیہات سے شہروں کی جانب بڑی ہجرتیں ہوئیں تاکہ پاکستان کی پیداواری شعبوں کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ اس وقت بھی جنوبی ایشیاء میں شہری آبادی کا اضافہ سب سے زیادہ ہے۔ ایک تحقیق و اندازے کے مطابق جو اقوام متحدہ کے آبادی کے فنڈ نے کیا، 3030 تک پاکستان کی دیہی اور شہری آبادی برابر ہو جائے گی، یعنی یہ تصور کہ پاکستان صرف ایک زرعی ملک ہے ختم ہو جائے گا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ جاگیر داری اور سرداری نظام کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور مڈل کلاس کے پڑھے لکھے افراد صحیح معنوں میں اپنی طاقت استعمال کر سکیں گے۔ فیوڈل لارڈز کے لیے یہ ایک واضح اشارہ ہے کہ طاقت کس سمت میں جارہی ہے، وہ اسے نہیں روک سکیں گے۔

آج 40 فیصد سے زیادہ آبادی شہروں میں رہ رہی ہو۔ یعنی وہ 75 فیصد دیہاتی اور زرعی ترقی کا تصور بالکل بدل چکا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ کچھ اور ٹھوس اقتصادی حقیقتیں ہیں، جو پاکستان میں مڈل کلاس کی تشکیل میں زیادہ اہم ہوتی جارہی ہیں۔ آج شہری آبادی پاکستان کی مجموعی جی ڈی پی میں تین چوتھائی حصہ رکھتی ہے۔ حکومت کی آمدنی کا تقریباً تمام حصہ یہی شہری آبادی دیتی ہے

کیونکہ دیہات میں فیوڈل نظام کے تحت جاگیرداروں اور سرداروں نے اپنے آپ کو ٹیکس دینے سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے۔ دوسرے اسمبلیوں میں نمائندے بنے بیٹھے ہیں اور دیہی آبادی اور زرعی ترقی کے نام پر ٹیکس دینے سے ناصرف انکاری ہیں بلکہ جب ایسا موقع آتا ہے تو حکومت وقت کی چولیس تک ڈھیلی کر دیتے ہیں۔ سیلاب جیسے انسانی المیے ان کے لیے ٹیکس معاف کرانے کے مواقع بن جاتے ہیں۔ اسی تسلسل میں دیکھا جائے تو پاکستانی صنعتی شعبہ جو شہروں میں ہے، پاکستان کے جی ڈی پی کا ستائیس فیصد دیتا ہے، زرعی شعبہ صرف 19 فیصد ہے۔ باقی ماندہ سروسز سیکٹر سے حاصل ہوتا ہے جو بھی زیادہ تر شہری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کراچی دیہات سے شہر میں ہجرت کی وجہ سے دنیا کی سب سے زیادہ آبادی والے تین شہروں میں آچکا ہے۔ اگر دیہات سے شہری ہجرت اور آبادی میں تیز رفتار اضافہ اسی طرح جاری رہا تو جلدی ایسے کئی کراچی پاکستان میں وجود میں آنے والے ہیں۔ اطمینان بخش امر یہ ہے کہ پاکستان کی مڈل کلاس اپنی جدید تعلیم و تربیت کی وجہ سے اس کی معیار پر کتنے ہی سوالیہ نشان موجود ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہی ہیں، بلکہ اسے مہارت سے بروئے کار بھی لا رہی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن کے مطابق ملک میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد میں سالانہ 165 فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ موبائل فونز کے فروغ میں جنوبی ایشیاء میں یہ اضافہ سب سے زیادہ ہے جو 56 فیصد تک ہے۔ آج دس کروڑ سے زیادہ موبائل فونز استعمال ہو رہے ہیں، یعنی ہر دوسرے پاکستانی کے ہاتھ میں موبائل فون ہے، جب کہ تمام موبائل کمپنیاں پاکستان میں کاروبار کر کے زبردست منافع کما رہی ہیں۔ یہ تمام اشاریے اور عوامل واضح طور پر نشان دہی کرتے ہیں کہ پڑھی لکھی مڈل کلاس اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے، جہاں سے تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ صرف اسے صحیح رہنمائی، موقع اور واضح ہدف اور ٹارگٹ کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ پھر تبدیلی کیوں نہیں آرہی؟ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا جاگیر دار طبقہ جو سرکاری طور پر آبادی کا صرف پانچ فیصد ہے اصل میں 64 فیصد سے بھی زیادہ زرعی املاک پر قابض ہے۔ اس طرح یہ پانچ فیصد افراد پچانوے فیصد آبادی کو کنٹرول کر رہے ہیں، جو مختلف قیود میں جکڑی ہوئی ہے۔ جن میں خود ساختہ روایات سے لے کر جاگیر دارانہ قوانین تک شامل ہیں، کبھی کبھی اس امر پر حیرانگی ہوتی ہے کہ میڈیا جو مڈل کلاس کی تبدیلی کے انقلاب کے نقیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ بھی خود جذبات کی رو میں بہے جا رہا ہے۔

پاکستان کی مڈل کلاس کا ایک بڑا حصہ بیرون ملک مقیم ہے اور ملک کے لیے خطیر زرمبادلہ کا اہم ذریعہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت ستر لاکھ سے زیادہ پاکستانی ملک سے باہر رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر برطانیہ، یورپ اور امریکہ میں ہیں۔ یہی وہ جگہیں ہیں جہاں سے ٹیکنالوجی اور اعلیٰ تعلیم بھی حاصل ہوتی ہے، روزگار بھی اور شہرت بھی، جبکہ عرب ممالک سے صرف ریال اور درہم۔ یاد رہے کہ جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ آسودہ حال پاکستانی جوان قومی معیشت میں انتہائی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ گلدگورنس کے ساتھ ملک چلانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس جدید خطوط پر ریاستی اداروں کو چلانے کی تربیت بھی ہے، دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے رابطے بھی اور ان کے اداروں کے ساتھ لین دین کے طریقہ بھی سب سے بڑھ کر وطن کے لیے ان کے دلوں میں وہ تشویش بھی پائی جاتی ہے۔ اس پر ہمیں غور نہیں بلکہ فوراً کام شروع کر دینا چاہئے کہ ہر میدان میں ہم بہت سا وقت ضائع کر چکے ہیں۔ پاکستان میں موجود مڈل کلاس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے دو طریقے مؤثر ہو سکتے ہیں۔

(1) سوشل میڈیا کا بڑے پیمانے پر استعمال

(2) بڑے شہروں سے واپس چھوٹے شہروں میں نوجوانوں کی منتقلی

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ پاکستانی میڈیا خاص کر الیکٹرانک میڈیا اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود اچھا رول ادا کر رہا ہے۔ کم از کم اس نے آزاد سوچ اور مسائل کے فوری سامنے لانے کا کردار تو شروع کر دیا ہے لیکن ترقیاتی معاملات میں سپورٹ کرنے کی نہ تو اس کے پاس حکمت عملی نظر آتی ہے، نہ سوچ اور نہ ہی زیادہ کام کرنے کی خواہش۔ ہم سوشل میڈیا کا ذکر کر رہے تھے، اس کا میاب استعمال مسلم ممالک خاص کر عرب ملکوں میں بڑے اچھے نتائج سامنے لا رہا ہے، چار دہائیوں سے رکھے بت پاش پاش ہو رہے ہیں اور تازہ ہوا کے جھونکے آرہے ہیں۔ پاکستان میں نوجوانوں کو اس میڈیا کا استعمال آتا ہے۔ ایک مربوط شکل دینے کے لیے صرف رہنمائی درکار ہے۔ پاکستان میں اربنائزیشن کے عمل کی رفتار خاصی تیز ہے۔ بڑے شہروں میں اس کی وجہ سے آنے والوں نے ہر شعبے میں نئے تجربے بھی حاصل کیے ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف صوبوں سے آنے والے لوگوں کو کراچی میں ایک بین الاقوامی شہر کا کلچر اور ٹیسٹ ملا ہے تو اس نے کئی دباؤ اور کش مکش جنم دیے ہیں، لیکن بلاشبہ ان آنے والوں کو تعلیم صحت، ماحول، بنیادی سہولتوں، آپس میں ہم آہنگی اور سوچ کے نئے انداز ملے ہیں۔ یہ سب مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ پڑھ لکھے نوجوان ان سارے تجربات کو یہیں پر خرچ نہ کریں، بلکہ اپنے آبائی علاقوں میں انھیں بروئے کار لا کر اپنے لوگوں کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے، ان میں ایک نئی فکر و سوچ لانے کا باعث بنیں۔ غالباً ان نوجوانوں میں وہ صلاحیت سب سے زیادہ ہے کہ وہ اپنے علاقے کی جاگیرداری اور سرداری نظام سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کر کے ایک نئی صبح امید کی بنیاد رکھیں۔ اس میں انھیں دو سبقتیں حاصل ہوں گی۔ اول تو ان کا اپنا علاقائی پن، دوئم بڑے شہر کا تجربہ اور ان کے یہاں کے نوجوانوں سے رابطہ۔ اس طرح مڈل کلاس کی ایک زنجیر بنتی چلی جائے گی جو شہروں سے

چھوٹے شہروں اور پھر گاؤں، دیہات تک پھیل کر ایک مستحکم اور دیرپا تبدیلی کا باعث بنے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روزگار کے مواقع ان کے آبائی علاقوں میں بڑے شہروں کے مقابلے میں کم ہیں لیکن اگر بھارت، جنوبی بھارت میں بنگلور اور مغربی علاقے میں گڑ گاؤں جیسے دیہات میں جدید آئی ٹی کی حیرت انگیز دنیا بنا سکتا ہے تو بڑے بڑے دعوے کرنے والے، پاکستانی صلاحیتوں کے معترف ماہرین اور سیاست دان یہ کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ قومی اور علاقائی ترقی، دونوں کے لیے اہم ترین ہے۔ جب یہ شہری اور دیہی ہم آہنگی مڈل کلاس کے درمیان پیدا ہو جائے گی تو ترقی کا وہ خواب جسے 64 برسوں میں دیکھتے دیکھتے ہم تھک چکے ہیں، ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے آجائے گا۔ مڈل کلاس کی طاقت ہی تبدیلی کی طاقت اور ترقی کا واحد راستہ ہے۔

معاشرہ کی اصل ترقی کاراز

جدید ملائیشیا کے معمار ڈاکٹر مہاتیر محمد نے ایک بار کہا تھا کہ وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد مجھے اندازہ ہوا کہ ملائیشیا کی اصل ترقی کاراز تعلیم میں پوشیدہ ہے لہذا حکومت ملائیشیا نے فوری طور پر تعلیم پر زیادہ سے زیادہ بجٹ مختص کرنا شروع کر دیا۔ جبکہ ایسا کرنے کے لیے انھیں دوسرے شعبوں کی سرمایہ کاری میں کٹوتی کرنا پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملائیشیا گزشتہ 30 سالوں سے تعلیم پر 30 فیصد بجٹ کی سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ آج قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ دنیائے اسلام کی کل اعلیٰ تکنیکی برآمدات کا 86 فیصد صرف ملائیشیا برآمد کرتا ہے جبکہ بقیہ صرف 14 فیصد برآمدات تمام 56 او آئی سی رکن ممالک کے ذریعے ہوتی ہے۔ ملائیشیا کی اہم برآمدات میں مائیکرو چپس، سپر کنڈکٹرز، ٹیلی ویژن اور دیگر گھریلو مصنوعات شامل ہیں۔ 1970ء میں ملائیشیا ایک غریب ملک تھا جس کی مجموعی پیداواری صلاحیت صرف 26 بلین امریکی ڈالر تھی اور اس کی معیشت کا انحصار نچلے درجے کی زراعت پر تھا۔ 2011ء تک اس کی مجموعی پیداواری صلاحیت بڑھ کر حیرت انگیز طور پر 280 بلین امریکی ڈالر ہو گئی۔ پاکستان کو از خود پیدا کردہ موجودہ اقتصادی بد حالی سے باہر نکلنے کے لیے علم پر مبنی معیشت کی منتقلی کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ اہم شعبوں کی ترقی پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ علم پر مبنی معیشت پر پندرہ سالہ منصوبے کا مسودہ 2004ء اور 2005ء میں میری قیادت کے زیر سایہ تیار کیا گیا تھا جو اگست 2007ء میں کابینہ سے منظور بھی ہو گیا تھا۔ اس کے تحت مختلف شعبوں میں مخصوص منصوبوں کے انعقاد کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ اس کی تیاری میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ملکی و غیر ملکی ماہرین جن میں نجی شعبوں سے تعلق رکھنے والے صوبائی اور وفاقی وزارتوں کے نمائندے اور ماہرین اقتصادیات کی مشاورت شامل تھی۔ اس 300 صفحاتی مسودے کی تیاری میں کوریا، سنگاپور، تائیوان اور ملائیشیا

کی کامیابیوں اور ان ممالک نے جدت طرازی اور سرمایہ کاری کے لیے جن پالیسیوں کو اختیار کیا ان کا بھی گہرائی سے جائزہ پیش کیا گیا تھا۔

1960 میں کوریا کی صورت حال پاکستان کی موجودہ صورت حال سے مختلف نہیں تھی۔ 17 سے 23 سال کی عمر کے محض پانچ فیصد نوجوان اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کر پاتے تھے اور اس کی برآمدات کی شرح صرف 30 بلین امریکی ڈالر تھی۔ جنرل پارک کی متحرک قیادت کے زیر سایہ جنوبی کوریا نے بڑی تیزی سے ترقی کی طرف قدم بڑھائے اور 2010ء تک تقریباً 90 فیصد 17 سے 23 سال کی عمر کی نوجوان نسل جامعہ کی سطح پر تعلیم سے مستفید ہونے لگی۔ جنوبی کوریا کی درآمدات کی شرح 350 بلین امریکی ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ کوریا میں تکنیکی ترقی کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک قانون جاری کیا گیا جس کے تحت تمام انجینئرنگ کے منصوبے مقامی کمپنیوں کو دیے جائیں گے اور وہ اس کے بڑے ٹھیکیدار کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں جبکہ غیر ملکی کمپنیاں چھوٹے ٹھیکیداروں کی حیثیت سے محض شراکت داری پر ان منصوبوں پر کام کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی کمپنیوں کو تکنیکی صلاحیتوں کے فروغ اور تکنیکی شعبے میں سیکھنے کے عمل کی حوصلہ افزائی کے لیے مالی ترغیبات بھی دی گئیں۔

دوسرا ملک جس سے ہم مزید سیکھ سکتے ہیں وہ ہے تائیوان۔ ہن شو سائنس و صنعتی پارک چین کی طرف سے تکنیکی بنیادوں پر کمپنیوں کے قیام کو فروغ دینے کے لیے کئے گئے بہت سے اقدامات میں سے ایک ہے۔ اس سائنس پارک میں 40 فیصد سے زائد کمپنیاں امریکی تعلیم یافتہ تائیوانیوں ہی نے شروع کیں۔ اس عمل کی سہولت کے لیے پارک ہی سے متصل جدید اور عمدہ طرز کی رہائشی سہولت بھی فراہم کی گئی۔ ساتھ ہی قانونی اور مالی خدمات کی بھی سہولت پارک میں فراہم کی گئی۔ یہ

پارک 1980ء میں وجود میں آیا اور جلد ہی ایک بڑی کامیابی بن گیا اور 20 سال کے عرصہ میں 1020000 کارکنوں کو ملازمتیں فراہم کیں جن کے ذریعے تقریباً 28 بلین امریکی ڈالر کی آمدنی حاصل ہوئی ہے۔ سرمایہ کاری کا سب سے تیز ما حاصل اور غربت کے خاتمے کے لیے سب سے زیادہ اثر انگیز شعبہ زراعت میں ترقی ہے کیونکہ اضافی زمین اور پانی کے وسائل محدود ہیں، تو ہمیں اپنی فصلوں کی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے تکنیکی طور پر پیداواری صلاحیت میں بہتری لانے کے لیے توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ فصلوں کی پیداوار ہمارے ملک میں ترقی یافتہ ممالک کی پیداواری صلاحیت سے نہایت کم ہے بلکہ چند ترقی پذیر ممالک سے بھی کم ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال گندم ہے جو ہماری مجموعی پیداواری صلاحیت (GDP) کا 29 فیصد حصہ ہے۔ تاہم گندم کی پیداوار نہایت کم ہے یعنی ملکی اوسط صرف 2.3 ملین ٹن فی ہیکٹر (HA/2.3MT) ہے جبکہ ترقی پسند کسان اس پیداوار کو دو گنا کر سکتے ہیں۔ لہذا زراعت کے مناسب طریقے استعمال کیے جائیں تو بہت زیادہ پیداواری صلاحیت موجود ہے اور تقریباً 3-2 فیصد اضافی حصہ اپنی GDP کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ بائیو ٹیکنالوجی تکنیک کے استعمال سے کیڑے مکوڑے کی قوت مزاحمت کو کم کیا جاسکتا ہے۔ زرعی عوامل کو خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ جس میں پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار کے لیے جدید تکنیکی عوامل شامل ہیں اور بائیو ٹیکنالوجی کے استعمال سے بہت سی فصلوں مثلاً گندم، چاول، کپاس، پھل سبزیاں اور پھولوں کی ایسی اقسام حاصل کی جاسکتی ہیں جن میں بیماری نہ لگے اور جس سے ان فصلوں کی پیداواری صلاحیت بڑھے۔ دوسرا سب سے اہم شعبہ انجینئرنگ ہے۔ انجینئرنگ کے شعبے میں گھریلو مصنوعات کی تیاری، بحری جہازوں کی تعمیر، ہوائی جہازوں کی تیاری سے لے کر بجلی کی مصنوعات مثلاً کمپیوٹر اور کمپیوٹر چپس،

دفاعی آلات اور صنعتی مشین وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشرف دور میں HEC نے انجینئرنگ کی تعلیم کو مضبوط بنانے پر بھرپور توجہ دی تھی۔

مزید دیگر شعبے جو توجہ کے طلبگار ہیں وہ ہیں انفارمیشن ٹیکنالوجی، ذرائع مواصلات، دواسازی کی صنعت، توانائی، کپڑا سازی کی صنعت، چمڑے کی صنعت، معاشی اور سماجی سائنسز بھی شامل ہیں۔ ان سب شعبوں کے لیے معیاری انسانی وسائل اور عمدہ کارکردگی کے مراکز کے قیام کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو سب سے زیادہ سرمایہ کاری اپنی اصل دولت یعنی نوجوان نسل پر کرنی چاہئے تاکہ ہمارے ملک کے 9 سال سے کمر عمر کے ایک کروڑ سے زائد نوجوانوں کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جاسکے۔ ترقی کے لیے ملک کو اپنی GDP کا کم از کم 7 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا ہوگا۔ جس کا ایک چوتھائی حصہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مختص ہو۔ اس کے علاوہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے پروگراموں میں بھی توسیع کرنی چاہئے۔ افسوس کہ جی ڈگریوں کے حامل 200 پارلیمانی اراکین اس ادارے کو تباہ کرنے پر تلے ہیں کیونکہ ان کے غلط عزائم کو اس ادارے سے خطرہ ہے۔ ہم علم و آگاہی کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں اور صرف وہی ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں جو اعلیٰ و معیاری تحقیق اور نئی مصنوعات کی مد میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔

باب دہم

متفرق

جنگ کی ضرورت کس لیے؟

اوڑی حملے کے بعد پاکستان بھارت پر جنگ کے سیاہ بادل منڈلا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ جنگ کس کی ضرورت ہے؟ تو آئیے آج کی نشست میں اس کا جائزہ لیتے ہیں، لیکن جائزے سے پہلے یہ جانیں کہ اسلام کا فلسفہ جنگ کیا ہے؟ اسلام کے فلسفہ جنگ کو اس حدیث کی روشنی میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ حتی الامکان جنگ سے بچنے کی کوشش کرو۔ اگر جنگ مسلط کر دی جائے تو پھر ڈٹ کر مقابلہ کرو یہاں تک کہ حق غالب آجائے۔ آپ ﷺ کی پوری کوشش ہوتی کہ کفار مکہ و مشرکین اور اس وقت کی عالمی طاقتوں فارس و روم کے ساتھ صلح صفائی سے ہی معاملات طے پا جائیں۔ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ جنگ کو آخری آپشن کے طور پر اختیار کرتے تھے۔ دین اسلام کی تعلیمات تو امن کا درس ہیں۔ مسلمانوں کے جدا مجد حضرت ابراہیم نے بھی بیت اللہ کو تعمیر کرنے کے بعد مکہ کے بارے میں بارگاہ الہی میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی کہ اے رب تو اس کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے آخری حدوں تک کوشش کی کہ جنگ نہ ہو۔ صلح حدیبیہ اس کی واضح مثال ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں جتنے لوگ جنگوں میں مرے ہیں اس کا 78 فیصد گزشتہ ساڑھے پانچ سو سالوں میں ہلاک ہوئے ہیں اور اکیسویں صدی میں انسانی تاریخ کی سب سے بڑی اور خوف ناک جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم 1914ء سے 1918ء تک چلی۔ ان چار سالوں میں یورپ کے ساڑھے چار کروڑ افراد مارے گئے۔ معذور اور زخمی ہونے والے اس کے علاوہ ہیں۔ دوسری جنگ عظیم 1939ء سے 1945ء تک لڑی گئی۔ ان چھ سالوں میں یورپ، امریکہ اور جاپان کے سوا چھ کروڑ لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ سب جنگیں امریکہ، یورپ اور مغرب نے اپنے مفادات کے لیے مسلط کیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ خونریزی سیکولر ازم، کیپٹل ازم اور لبرل ازم نے کی ہے۔ مائیکل

مین کی کتاب The Dark Side of Democracy کے مطابق امریکہ میں آنے والے جمہوری انقلاب میں امریکیوں نے 50 سال میں 10 کروڑ ریڈ انڈیز کو قتل کیا ہے۔ آج امریکہ جس بنیاد پر کھڑا ہے اس میں 10 کروڑ لوگوں کا خون ہے۔ جبکہ اسلامی تاریخ کے 15 سو سال کے اندر 10 لاکھ بھی قتل نہیں ہوئے۔ انقلاب فرانس، انقلاب روس اور انقلاب چین میں بھی 8 کروڑ سے زیادہ لوگ قتل کیے گئے۔ یہ تینوں سیکولر انقلاب تھے۔ لاطینی امریکہ میں انقلاب لانے کے لیے دو کروڑ قتل کیے گئے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم خالص سیکولر جنگیں تھیں۔ ان جنگوں کا مطلب یہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ایسی جنگ عظیم اس سے پہلے کبھی ہوئی ہی نہیں۔ دونوں جنگوں میں جموعی طور پر کروڑ سے زائد لوگ قتل کیے گئے۔ یہ سب سیکولر جنگیں تھیں۔ امریکہ نے اپنے یوم آزادی سے ہی تشدد و بربریت کا راستہ اپنایا ہوا ہے۔ 1776ء سے اب تک امریکی مسلح امریکی مسلح افواج 227 مرتبہ اقوام عالم کے خلاف جارحیت کی مرتکب ہو چکی ہیں۔ ان 239 سالوں میں دو سو بیس مرتبہ جارحیت کے ارتکاب کی یہ شرح کسی بھی ملک کی شرح جارحیت سے کئی گنا زیادہ اور بیشتر صورتوں میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اس کی وجہ پوچھی جائے تو وہ سمجھ میں آسکتی تو ہے۔ چنگیز خان کی گردن پر 34 ملین اور ہلاکو خان کی گردن پر صرف 4 ملین افراد کا خون بتایا جاتا ہے۔ تیمور لنگ کی خون آشام تموار 14 ملین کا خون پی گئی جبکہ جرمن نازی رہنما ایڈولف ہٹلر کو 21 ملین کا جان لیوا بتایا جاتا ہے۔ یہ کل 73 ملین افراد ہوئے جبکہ امریکہ کے ذمہ اب تک 171.5 ملین افراد کا قتل بلا شک و شبہ ثابت ہے۔ آئیے حساب لگاتے ہیں۔ ریڈ انڈیز 100 ملین، افریقن 60 ملین، ویت نامی، المین، عراقی ایک ملین، افغان نصف ملین ہے۔ کل فرد جرم 171.5 ملین بنتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیے اگر سے ملین مطلع مین کے قاتلوں کو انسانیت کا قاتل کہا جاتا ہے تو اسے ملین سے زیادہ کی رگ جان سے خون پیلنے والے امریکہ کو کیا نام دینا چاہئے؟ دوسری جنگ عظیم کے بعد

سے امریکہ 24 ملکوں پر بمباری کا مرتکب ہو چکا ہے۔ سب سے بڑھ کر جاپان پر ایٹمی حملہ کر کے پوری دنیا میں جارحیت اور بربریت کا اعزاز بھی اسی امریکہ کو حاصل ہے۔ امریکی دانشوروں میں اگر انسانیت کی رمت باقی ہوتی تو ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہم برسائے کے بعد اپنے حکمرانوں کو جوہری ہتھیار تلف کر دینے کی تلقین کرتے۔ لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا بلکہ پوری دنیا پر جو بدراہٹ قائم کرنے کے نظریے اور استعماری عزائم کی بنا پر امریکہ 1945ء سے 2015ء تک دنیا میں مجموعی طور پر 108 بڑی جنگیں لڑ چکا ہے۔ ان جنگوں میں بارود کا کھلم کھلا استعمال ہوا ہے۔ گھر چلے، شہر ویران ہوئے، لاشیں گریں، زخمیوں کی چیخوں اور مرنے والوں کی آہوں سے زمین اور آسمان کے دامن میں چھید ہوئے۔ ان سب جنگوں کے پیچھے ایک ہی نظر یہ تھا۔ بعض جنگیں امریکہ نے براہ راست لڑیں بعض میں وہ شریک ہوا اور بعض میں اس کا اسلحہ استعمال ہوا۔ وہ جنگیں جن میں امریکہ شامل نہیں تھا، ان میں بھی مرنے والوں کے خون کے چھینٹے امریکی آستینوں پر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان ایک سو آٹھ جنگوں میں 1996ء تک ایک کروڑ نوے لاکھ تہتر ہزار انسان ہلاک ہوئے۔ ان تمام جنگوں کے پیچھے امریکہ تھا، ان تمام جنگوں میں امریکی اسلحہ استعمال ہوا۔ استعماری عزائم رکھنے والی اسلحہ ساز کمپنیوں نے دونوں ہی ملکوں اور فریقوں کو علانیہ اور مخفیہ طریقے سے جنگی اسلحہ اور سرمایہ فراہم کیا۔ اس وقت بھی دنیا میں 68 ایسے تنازعات موجود ہیں جو دنیا کے 43 فیصد معاشی وسائل کھا رہے ہیں۔ یہ لڑائی جھگڑے اور تنازعات ایسے ہیں جو باسانی حل ہو سکتے ہیں لیکن عالمی طاقتیں اس کا حل چاہتی ہی نہیں۔ دراصل امریکہ کو عالمی قیادت کا ہو گا ہے لیکن اس کے لیے جس اخلاقی بلندی، وسعت ظرفی اور انسانی رویوں سے آراستگی کی ضرورت ہے، نا صرف یہ کہ امریکہ اس کے عشرِ عشیر کو نہیں پہنچاتا بلکہ اس حوالے سے اس قدر پستی کا شکار ہے اور ایسے بدترین ریکارڈ کا حامل ہے کہ اسے عالمی قیادت کے منصب پر فائز کرنا تو کجا،

عالمی برادری کی پچھلی صفوں میں شامل کرنا بھی محلِ نظر ہے۔ 1991ء میں روس کی شکست کے بعد امریکہ کے مرتب کردہ نیورلڈ آرڈر میں کہا گیا ہے

کہ اب پوری دنیا پر بلا شرکت غیرے ہماری حکمرانی ہوگی۔ جہاں کہیں بھی امریکی مفادات کو خطرات لاحق ہوں گے وہاں وہ کاروائی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ نیورلڈ آرڈر کے ذریعے اصل میں امریکہ عالمی تھانیداری کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے جو دھوئی آج کا سپر پاور کرتا ہے کبھی قیصر و کسری بھی یہی کہتے تھے۔ مگر آج ان کا نام و نشان نہیں۔ 1945ء سے پہلے جرمنی بھی یہی دعویٰ کرتا تھا۔ پوری دنیا پر حکمرانی کا حق صرف جرمنوں کو ہے۔ 1950ء کے بعد روس کا طوطی بولتا تھا۔ 1990ء کے بعد یہی کچھ امریکہ سوچ رہا ہے اور اس کے لیے وہ سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کو قرار دیتا ہے۔ زمینی حقائق بتاتے ہیں دنیا کو اصل خطرہ امریکی سامراج سے ہے۔ اس تناظر اور پس منظر میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاک بھارت جنگ کس کی ضرورت ہے؟ وہ کون کون سی عالمی طاقتیں اور ملٹی نیشنل سازشی کمپنیاں ہیں جو دونوں ہی ملکوں کو دھڑا دھڑا اسلحہ بھی دے رہی ہیں اور ہلاشیری بھی؟؟

چین کا ترقیاتی ماڈل

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ایوان اقتدار کے اصلی اور وڈے سمجھتے ہیں کہ معاشی ترقی کے لیے جمہوری نظام کا چلنا لازم نہیں ہے۔ غالباً ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر دنیا میں تیز ترین معاشی ترقی کرنے والے ملک چین نے اپنے مقاصد غیر جمہوری نظام میں حاصل کئے ہیں تو پاکستان ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں میڈیا اور سوشل ویب سائٹوں پر بھی اس طرح کی تحریریں سامنے آئی ہیں جن میں چین کے ترقیاتی ماڈل کی مثال دی گئی ہے۔ یہ حقیقت تو اپنی جگہ پر ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی گرفت میں رہتے ہوئے بھی چین نے پچھلے ہمیں چالیس برسوں میں جو ترقی کی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ چین اور پاکستان کی صورت حال میں بہت بنیادی فرق ہے اور بہت سی مماثلتوں کے باوجود دونوں نظاموں میں کوئی قدر مشترک ناپید ہے۔ چین میں ہر ادارہ کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ تحت کام کرتا ہے اور کسی بھی پارٹی کو منظور شدہ حدود سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ غالباً ایسے ماڈل کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان میں طاقت کا کنٹرول مرکز ہو رہا ہے۔ چین اور پاکستان کو متوازی نظام سمجھنے والے دلیل دے سکتے ہیں کہ دونوں ریاستیں نظریاتی ہیں، دونوں میں منڈی کا نظام ہے اور دونوں میں بالواسطہ یا لالواسطہ اقلیتوں پر حدود و قیود قائم ہیں۔ اسی طرح اور بھی کئی مماثلتیں ڈھونڈی جاسکتی ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان بھی نظریاتی ریاست ہوتے ہوئے چین کی طرح ترقی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں چین کی طرح بدعنوانیوں کا خاتمہ کر کے ترقی کے راستے پر گامزن ہوا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چین اور پاکستان کا نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

دونوں کی نظریاتی اساس ایک دوسرے سے متخارب اصولوں پر قائم ہے۔ اگرچہ چین نے جب بیسویں صدی کے روایتی سوشلزم سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے منڈیوں کا نظام اختیار کیا تو اس سے یہ تاثر ابھر کہ چین نے دنیا کے باقی سرمایہ دار ملکوں کا راستہ اپنایا ہے۔ لیکن چین کی کمیونسٹ پارٹی اس دعوے پر قائم رہی کہ وہ مارکسزم کے راستے پر چل رہی ہے۔ ابھی چند ہفتے پہلے جب کارل مارکس کی دسویں سالگرہ منائی جا رہی تھی تو ناصرف چین نے ان کے پیدائش قصبے میں ان کا مجسمہ نصب کیا بلکہ اس موقع پر صدر رشی جن پنگ نے مارکس اور اینگلس کے کمیونسٹ مینی فیسٹو کو اجتماعی سطح پر پڑھنا لازم قرار دیا۔ غالباً چینی کمیونسٹ پارٹی سی جھتی ہے کہ چین کی صنعتی ترقی کے بغیر سوشلزم کی منزل تک نہیں پہنچا جاسکتا اور صنعتی ترقی کے لیے سرمایہ داری کے کچھ اداروں کو نظام میں داخل کرنا پڑے گا۔ لیکن پارٹی اور اس کے رہنمایہ بھی سمجھتے ہیں کہ مارکسزم کا یہ اصول اولین حیثیت رکھتا ہے کہ تمام تبدیلیوں کی بنیاد مادی ذرائع کی تبدیلی میں پنہاں ہے۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد ماکس فلفے پر استوار ہوئی تھی جس کی تشریح ماوزے تنگ نے چینی حالات کے مطابق کی۔ اس نظرس نظر یے کو اپناتے ہوئے چین میں جاگیر داری کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا۔ ناصرف یہ صرف یہ بلکہ جاگیر داری کلچر کی باقیات کو ختم کرنے کے لیے بہت ہی تشدد قسم کا ثقافتی انقلاب برپا کیا گیا۔ اس ثقافتی انقلاب میں انتہائی نوعیت کے منفی رجحانات بھی سامنے آئے لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس کے باوجود ماوزے تنگ کی تنظیم قائم رہی۔ اسی کی دہائی تک آتے آتے چین جاگیر داری کے شکنجے سے ہر طرح سے آزاد ہو چکا تھا، عوام میں تعلیم کا نظام ہر سطح پر رائج ہو چکا تھا اور عوام میں صلاحیتوں کی سطح بہت بلند ہو چکی تھی۔ غرض یہ کہ چین ہر طرح سے صنعتی انقلاب کے لیے تیار تھا اور اس کے عوام میں جدید ٹیکنالوجی کو اپنانے کی صلاحیت موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چین تین چار دہائیوں میں دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن گیا ہے۔

اس کے برخلاف پاکستان میں جاگیر داری نظام مضبوطی سے قائم رہا اور نظریاتی سطح پر مذہبی اصولوں کو مقدم بنانے کی کوششیں بڑھتی گئیں۔ اگر مارکسزم کی بنیاد پر چین مادی تبدیلیوں کو رہنما اصول کے طور پر اپناتا رہا تو پاکستان میں مذہبی اساس پر روحانی نظام کی ترویج دی گئی۔ اگر چین کے نظریات اس مادی دنیا کو تبدیل کرنے پر بنائے گئے ہیں تو پاکستان کے مذہبی فلسفے میں آخرت بہتر بنانے کو ترجیح دی گئی ہے۔ چین میں سیاسی مرکزیت اور کنٹرول کو چھوڑ کر سماجی اور انفرادی سطح پر ہر قسم کی آزادی ہے جبکہ پاکستان میں مذہبی نظام کے تحت سماجی اور انفرادی زندگی کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھالنے کا عمل جاری ہے۔ چین میں سیاسی بیانیے پر کنٹرول کے علاوہ معاشرہ ہر پہلو سے مغربی اقدار کو اپنا چکا ہے اور ذاتی زندگی میں کسی طرح کی قدغنیں نہیں ہیں جبکہ پاکستان میں اس کے الٹ ہو رہا ہے۔ شاید پاکستان میں بھی عوامی سطح پر سرمایہ دار معاشروں کی اقدار آہستہ آہستہ اپنی جڑیں لگا چکی ہیں لیکن ریاست ان کی پیروی کرنے والے نظریات کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو چین اور پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ چین اپنے مکتب فکر کے سیاق و سباق میں شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ جب پاکستان کی مادی بنیاد میں تبدیل ہو جائیں گی تو اس کی نظریاتی ساخت بھی بدل جائے گی۔ اسی لیے وہ سی پیک کے ذریعے سے پاکستان میں معاشی ترقی کو تیز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کی کچھ طاقتیں یہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ مذہبی روایت پرستی کو ڈھال بنا کر سیاسی مرکزیت پیدا کر سکتی ہیں اور معاشی ترقی خود بخود ہوتی جائے گی۔ مختلف اطراف سے آنے والی رپورٹوں کے مطابق چینی پاکستان کے بارے میں اب بہت زیادہ پر امید نہیں ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان مذہبی انتہا پسندی کو روکنے کی مناسب کوششیں نہیں کر رہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چین پاکستان میں بنیادی تبدیلی کے لیے کتنی دیر انتظار کر سکتا ہے۔

زرعی ایمر جنسی کا نفاذ

پاکستان کسان اتحاد کو پاکستان میں زراعت کو درپیش مسائل نے بحران پر کل جماعتی کانفرنس کا انعقاد کر کے جتنی تشہیر اور توجہ ملی، اسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے ناحق زحمت کی۔ اگلی صبح جب اخبارات پر نگاہ ڈالی تو اس کانفرنس کی بمشکل ہی کوئی رپورٹنگ دکھائی دی۔

در اصل میڈیا یا حکمران اشرفیہ کے لیے زراعت کوئی پرکشش موضوع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی گراؤٹ پر کسی کو تشویش لاحق ہوگی۔ ہوٹلوں میں ہونے والی خوردونوش کے دھوئیں سب کو مرغوب ہوتے ہیں لیکن معاف کیجئے زراعت اور اس پر غور و فکر ایسا مسئلہ نہیں ہے جو پاکستانیوں کی توجہ حاصل کر سکے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے جبکہ اس کی ساٹھ فیصد افرادی قوت کسی نہ کسی طور پر زراعت کے شعبے سے منسلک ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ موجودہ پاکستان پر شہری طبقات کو بالادستی حاصل ہے۔ ایک لمحے کے لیے اس دیومالائی تصور کو دفن کر دیں کہ ہماری اسمبلیاں زرعی طبقے کا مفاد ملحوظ خاطر رکھتی ہیں، چنانچہ زراعت سے وابستہ امور پر بات چیت کی جاتی ہے۔ درحقیقت ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ معیشت سے متعلق فیصلہ سازی شہروں میں رہنے والے دولت مند افراد کرتے ہیں۔ اس میں دیہات میں کاشت کاری کرنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ دیہاتی علاقوں سے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں جانے والے تمام سیاست دان کاشت کار نہیں ہوتے۔ یقیناً ان کی زمینیں ہوتی ہیں لیکن اب وہ صنعت کار ہیں، ان کی شوگر ملیں اور ریل اسٹیٹ بزنس پھل پھول رہا ہوتا ہے اور پھر اسٹاک ایکس چینج میں بھی ان کی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔

کوئی بھی اہم سیاسی گھرانہ صرف زراعت پر تکیہ نہیں کر سکتا۔ اس موضوع کو چھیڑنے کی سادہ کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے قیام سے لے کر اب تک زراعت کے شعبے کو کبھی اتنے سنگین بحران کا سامنا نہیں تھا جتنا آج ہے۔ اس میں مبالغہ آرائی نہیں، آج کسان، بلکہ اچھا خاصا زمیندار، جس کی آمدنی کا تمام تر انحصار زراعت پر ہو، سنگین مالی بحران کا شکار ہے۔ اسے فصلیں اگانے کے لیے بہت بھاری رقم خرچ کرنا پڑتی ہے لیکن زرعی اجناس کی قیمت انتہائی کم ہو چکی ہے۔ چنانچہ بہت سے سفید پوش کا شکاروں کی جیب خالی ہے۔ وہ فریاد کر رہے ہیں لیکن ان کی سننے والا کوئی نہیں، کسی کو بھی ان کے حال زار سے کوئی سروکار نہیں۔ ملک کے تمام اختیاران افراد کے ہاتھ میں ہے جن کی دنیا میں فارم ہاؤسز اور بڑے بڑے محلات کی چمک تو ملتی ہے لیکن زراعت کا شگوفہ نہیں پھوٹتا۔ ہمارے ملک میں فارم ہاؤس بنانے کا مطلب زندگی کی معراج حاصل کر لینا ہے۔

ہمارے وزیر اعظم بہت فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ملک میں آلو پانچ روپے کلو کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ایسا ہے یا نہیں۔ اگر اس قیمت پر آلو فروخت ہو گا تو اس کا مطلب کہ کسان کی تباہی یقینی ہے لیکن بیان دیتے وقت وزیر اعظم کے چہرے پر طمانیت اور سکون بھری کیفیت واضح دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے حتمی منصوبوں میں کسان موجود نہیں۔ شہروں میں کسی بار پر احتجاج ہو تو حکمرانوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن خاطر جمع رکھیں، زراعت، مرتخ یا اس سے بھی پار کسی اور دنیا کا معاملہ ہے۔ ہمیں اس سے کیا لگے؟

در حقیقت ہمارے ہاں کا کسان کسی اتحاد اور تنظیم سے عاری، ایک منتشر طبقہ ہے۔ چنانچہ ان کے خلاف تھوڑی سی پولیس تعینات کر کے کام چل جاتا ہے۔ تاہم جس طرح بھارت میں ہریانہ کی جٹ برادری نے گزشتہ چند دنوں سے احتجاجی مظاہرے کئے ہیں، اس کی پاکستان میں کوئی جھلک

نہیں ملتی۔ جس طریقے سے ہم نے پاکستان میں ترقی کی ہے تو اس اسلامی جمہوریہ میں گائے کے دودھ کی بوتل سے منزل واٹر کی بوتل زیادہ مہنگی ہے۔ یہاں کثیر ملکی کمپنیوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ مقامی گوالے کو نقصان پہنچا کر دودھ کا کاروبار کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ پاکستان جیسے ایک زرعی ملک میں ڈبے والے اور خشک دودھ کے استعمال کی روایت کو پروان چڑھنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے تھی۔ بوتلوں میں تازہ دودھ ملنا چاہئے۔ یورپ میں ایسا ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں نہیں۔ ہم گزشتہ ساٹھ برس سے کسی منصوبے کے تحت کام کرنے کے بجائے جزوقتی اقدامات کے تحت معاملات چلا رہے ہیں۔ اس وقت معاملات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اب پلاننگ یا منصوبہ بندی نہیں بلکہ کسی کلہاڑے کی ضرورت ہے۔

سرکاری تعلیم کی حالت کس طرح درست ہوگی؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی بچک کے بغیر نجی تعلیمی اداروں پر پابندی لگادیں اور ہر کسی کو مجبور کریں کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکول میں بھیجے۔ آپ دیکھیں کہ پھر ان اسکولوں کو فنڈز بھی ملنا شروع ہو جائیں گے اور ان کی حالت بھی بہتر ہوگی۔ نجی ہسپتالوں کی حوصلہ شکنی کریں، جعلی میڈیکل کالجوں کی مشروم گروتھ کو روک دیں تو آپ کو سرکاری ہیلتھ کیئر کا بہتر معیار دکھائی دینے لگے گا۔ یہی بات منزل واٹر اور ڈبے والے دودھ پر بھی صادق آتی ہے۔ جب عام سرکاری ملازم سے لے کر اعلیٰ افسر تک، سب کو ایک جیسا پانی اور دودھ پینے کو ملے گا تو راتوں رات آپ کے گھر کے نلکے میں آنے والا پانی بھی پینے کے قابل ہو جائے گا۔

کسان اتحاد کانفرنس کے صدر خالد محمود کھوکھڑ نے بہت متاثر کن جائزہ پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سبزیوں کی قیمت بڑھتی ہے تو ضلعی انتظامیہ کے افسران صبح سبزی منڈیوں میں پہنچ کر

قیمت کم کر دیتے ہیں لیکن جب قیمتیں زمین بوس ہو جاتی ہیں اور کسان شدید نقصان کا سامنا کرتے ہوئے دہائی دیتے ہیں تو یہی افسران کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ سرحد پار، اگرچہ بھارتی کسانوں نے اس مرتبہ دباؤ ڈال کر کچھ مطالبات منوالئے ہیں لیکن بے شمار واقعات ایسے ہیں جب مسائل سے مجبور کسان خود کشی تک کر لیتے ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ بھارتی پنجاب میں زراعت کو بھاری سبسڈی ملتی ہے۔ ڈیزل اور کھادیں سستی ہیں اور ٹیوب ویل کے لیے بجلی مفت ہے۔ دوسری طرف ان تمام مراعات سے محروم پاکستانی کسان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کا مقابلہ کرے گا۔ گزشتہ چند برسوں سے ہمارے ہاں اہم ترین نقد آور فصل کپاس اور چاول کی قیمت گر چکی ہے۔ اس کی وجہ سے کسان کا بہت اوتھال ہوا لیکن حکومت اس کے بچاؤ کے لیے آگے نہ بڑھی۔ تاثر ہے کہ شوگر کی صنعت کو کسی ہلکی سی پریشانی کا بھی سامنا ہو تو حکومتی حلقوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس کا تدارک کیا جاتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے اہم ترین سیاسی گھرانے اس کا روبرو سے وابستہ ہیں۔

کسان اتحاد کا مطالبہ ہے کہ ملک میں زرعی ایمر جنسی نافذ کی جائے لیکن یہ فریاد کس سماعت کو متاثر کرے گی؟ جن کے ہاتھ میں ملک کے تمام اختیار ہے ان کی دلچسپی کا محور میٹروٹرنینس اور بھاری بھر کم چکا چونند منصوبے ہیں۔ ان کی رومانوی دنیا میں تعلیم، صحت اور زراعت کا گزر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شعبوں میں کوئی بظاہر کشش نہیں۔ چاول تھیلے، اسپتال کے بیڈ یا کمرہ جماعت کا چمکتی دمکتی سرخ میٹر و سے کیا مقابلہ؟ اگر کسان اتحاد سمجھتا ہے کہ ان کی بات سنی جائے تو انھیں **التباسات** کی دنیا سے باہر آ جانا چاہئے۔ چنانچہ کسانوں کو پہلے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے اس کے لیے کسان اتحاد اچھا کام کر رہا ہے لیکن اپنی آواز با اختیار افراد کے کانوں تک پہنچانے کے لیے انھیں کچھ اور کرنا ہو گا۔ پاکستانی کسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کو ووٹ دیتا ہے لیکن وہ

جماعتیں چاہے پی پی پی ہو یا پی ایم ایل (ن)، اس کے مسائل کو درخور اعتنا نہیں گردانتیں۔ اس وقت پنجاب اور سندھ کے دیہی علاقوں میں بے چینی کی فضا گہری ہوتی جا رہی ہے۔ کسان کو چاہئے کہ وہ ان علاقوں کا نمائندہ بن کر اٹھے۔ اس کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا؟ ماضی میں وہ بڑی بڑی ریلیوں کا انعقاد کرتے تھے لیکن وہ بھاشانی اور بھٹو کا دور تھا۔ اب یہ نیا دور ہے، تبدیلی کے نئے دعویدار میدان میں ہیں۔ پاکستان کو تبدیلی کی ضرورت ہے، لیکن ایسا کون کرے گا؟

لائسٹاک کے شعبہ پر توجہ دینے کی ضرورت

پاکستان میں زرعی معیشت کا 49 فیصد سے زائد حصہ لائسٹاک سے حاصل ہوتا ہے۔ دیہی علاقوں میں 69 فیصد آبادی کا زیادہ تر پیشہ مویشی پالنا ہے۔ زراعت سے وابستہ بیشتر لوگ تھوڑے بہت جانور ضرور رکھتے ہیں جس سے دودھ اور گوشت کے علاوہ دیگر ضروریات زندگی بھی پوری ہوتی ہیں۔ کاشتکار زرعی مداخل بھی جانور فروخت کر کے خریدتے ہیں۔ اس طرح زراعت کے ساتھ لائسٹاک کی اہمیت کے پیش نظر متعدد پراجیکٹس شروع کئے مگر افسر شاہی حکمرانوں کے ذاتی مفادات کے باعث اربوں روپے کی مالیت سے چلنے والے تمام پراجیکٹس مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ سابقہ حکومت نے نیشنل لائسٹاک پالیسی بھی مرتب کی جس پر کافی حد تک کام بھی ہوا مگر لائسٹاک کا شعبہ وہ ترقی نہ کر سکا جو اسے کرنا چاہئے تھی۔

وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے پہلے سے موجود محکمہ لائسٹاک کے نیٹ ورک کے علاوہ علیحدہ سے اربوں روپے کے فنڈز خرچ کر کے پراجیکٹس تیار کیے جن میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین حیوانات کو بھاری تنخواہوں پر بھرتی کیا گیا۔ ان کو جدید ترین سہولیات، آرام دہ دفاتر اور گاڑیاں بھی فراہم کی گئیں۔ بلکہ محکمہ لائسٹاک کے تجربہ کار ماہرین کو ہدایات کی گئیں کہ ان پراجیکٹس کے ماہرین کی رہنمائی اور معاونت کریں۔ اس طرح وفاقی وزارت زراعت و خوراک و لائسٹاک نے لائسٹاک اینڈ ڈیری ڈویلپمنٹ بورڈ تشکیل دیا جس کے اغراض و مقاصد مقرر کئے گئے۔ اس بورڈ کے تحت ملک میں دودھ اور گوشت کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک پروگرام مرتب کیا گیا جس کے تحت صرف بڑے ز جانور پالنے والے مویشی پال کے فارم رجسٹرڈ کر کے کم از کم 10 بچھڑے پالنے پر مویشی پال کو فی جانور چار ماہ بعد فروخت کرنے پر 14 سو روپے کی مالی معاونت کرنا

تھی بلکہ مذکورہ فارموں کے رجسٹرڈ جانوروں کا علاج معالجہ اور ویکسینیشن وغیرہ بھی اس کی ذمہ داری تھی لیکن بورڈ کا طریقہ کار اور فیلڈ سٹاف کی غفلت کے باعث مویشی پال نر جانور پالنے میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ بورڈ کے حکام کی طرف سے بروقت ادائیگیاں نہ ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ بھی بری طرح ناکام ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح صوبائی سطح پر لائیوسٹاک اینڈ ڈیری ڈویلپمنٹ کمپنی قائم کی گئی جس کے تحت مویشی پال حضرات کو جدید ڈیری فارمنگ کے لیے جدید تقاضوں کے مطابق ڈیری فارم بنانے کے لیے کمرشل بنکوں کے ذریعے آسان شرائط پر قرضے دلوا کر جدید ڈیری فارم بنانے میں ان کی معاونت کرنا تھی۔ اس کمپنی کے تحت سینکڑوں ویٹرنری ڈاکٹر زبھر تی کئے گئے۔ ڈویژنل ریجنل ہیڈ کے عہدوں پر ریٹائرڈ فوجی افسران کو رکھا گیا مگر یہ کمپنی صرف بڑے کسانوں اور زمینداروں کو نواز رہی ہے جبکہ بے زمین کسانوں کو اس کے ذریعے کوئی فائدہ نہیں دیا جا رہا۔ کمپنی کے افسران سمیت فیلڈ سٹاف صرف مفید مشوروں اور فریبلٹی بنا کر دینے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ جنوبی پنجاب میں لائیوسٹاک اینڈ ڈیری ڈویلپمنٹ کمپنی نے بہت کم تعداد میں جدید فارم بنوائے ہیں اور یہ کمپنی بھی لائیوسٹاک کے فروغ میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔

سابقہ حکومت پنجاب نے مختلف علاقائی جانوروں کی افزائش نسل کے لیے مختلف پروگرام شروع کئے جس میں تحفظ ساہیوال نسل گائے پروگرام اور تحفظ چولستان نسل گائے کے علاوہ بھینسوں کی نسلوں کے تحفظ کے لیے بھی پروگرام شروع ہیں۔ لائیوسٹاک کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کے دورہ آسٹریلیا کے دوران مختلف آسٹریلین وفود نے صدر سے ملاقاتیں کیں اور تبادلہ خیال کیا۔ ان میں سے ایک وفد آسٹریلین ماہرین حیوانات کا تھا جنہوں نے پاکستان میں لائیوسٹاک کے مستقبل کو روشن کیا۔ انہوں نے صدر کو بتایا کہ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پردودھ اور گوشت کی ضروریات کو صرف ایک ہی نسل کے جانور پوری کر سکتے

ہیں اور وہ ہے ساہیوال نسل کی گائے جو ہر قسم کا موسم برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جس میں مختلف بیماریوں کے خلاف قدرتِ مدافعت کئی گنا زیادہ پائی جاتی ہے۔ ساہیوال نسل کی گائے دنیا کے تمام ممالک میں پالی جاسکتی ہے جبکہ فریزن اور آسٹریلیا گائے صرف ان سرد ممالک میں پالی جاسکتی ہے، گرم ممالک میں ان کا زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ ساہیوال نسل کی گائے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر چیچڑ کا حملہ بہت کم ہوتا ہے۔

حکومت نے ساہیوال نسل کی گائے کی حفاظت اور بہتر پرورش کے لیے ایک پراجیکٹ بنانے کی ہدایت کی جس پر وزارتِ زراعت و خوراک و لائیوسٹاک اور صوبائی حکومت پنجاب نے محکمہ لائیوسٹاک پنجاب کو 87 ملین روپے کی خطیر رقم سے پانچ سالہ پراجیکٹ تیار کر کے دیا جو 2003ء سے شروع ہے۔ اس کی بہترین تجربہ گاہ گورنمنٹ لائیوسٹاک فارم جہانگیر آباد ہے۔ ابتدا میں اس پراجیکٹ کے لیے پانچ اضلاع منتخب کئے گئے جن میں خانیوال، جھنگ، فیصل آباد، ساہیوال اور اوکاڑہ شامل تھے۔ بعد میں اس وقت کے صوبائی وزیر لائیوسٹاک پنجاب سید ہارون سلطان (جو ضلع مظفر گڑھ سے تعلق رکھتے تھے) نے اس پراجیکٹ میں ضلع مظفر گڑھ کو شامل کروایا۔ اس طرح اس وقت کے صوبائی سیکرٹری لائیوسٹاک پنجاب (جو ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ڈی سی او سے سیکرٹری لائیوسٹاک بنے تھے) نے اپنے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ساہیوال نسل گائے کے تحفظ پراجیکٹ میں شامل کر دیا۔ اس طرح کچھ عرصہ بعد افسر شاہی نے اپنی سہولت کی خاطر اس پراجیکٹ کا ہیڈ آفس جہانگیر آباد لائیوسٹاک فارم ساہیوال سے ختم کر کے ضلع جھنگ میں منتقل کر دیا۔ اب اس کے اعلیٰ افسران جھنگ میں بیٹھے ہیں جبکہ پراجیکٹ پر تحقیقی کام جہانگیر آباد لائیوسٹاک فارم پر کیا جاتا ہے۔ پراجیکٹ 06-2008ء میں ختم ہونا ہے مگر اس کے خاطر خواہ نتائج دیکھنے میں نہیں آئے۔ متعلقہ

افسران اور اس وقت کے حکمرانوں نے ذاتی پسند اور مفادات کے باعث وہ اضلاع نظر انداز کر دیے جہاں پر ساہیوال نسل کی گائے زیادہ تعداد میں پہلے سے موجود تھی۔

ضلع ملتان میں ساہیوال نسل کی گائے کی دگنی تعداد ضلع ملتان اور لودھراں میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح حکومت پنجاب نے بھی کروڑوں روپے کی لاگت سے لائیوسٹاک سروسز پروگرام بھی شروع کیا لیکن سابقہ وزیر اعلیٰ پنجاب نے یہ پروگرام بھی صرف اپر پنجاب تک محدود کر دیا۔ سب سے پہلے لاہور، گوجرانوالہ اور گجرات میں یہ پروگرام شروع کیا گیا۔ اس کے تحت مذکورہ اضلاع میں جانوروں کے مفت علاج معالجے کے علاوہ موبائل ویٹرنری ڈسپنسریاں، ویٹرنری آپریشن تھیٹر اور ویٹرنری ہسپتال قائم کئے گئے۔ اس پروگرام کے تحت کافی تعداد میں فیلڈ سٹاف بھرتی کیا گیا ہے۔ سابقہ حکومت نے اپنے آخری ایام میں ملتان میں بھی لائیوسٹاک سروسز پروگرام شروع کرنے کا اعلان کیا مگر یہ اعلان ہی رہا۔ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ حکومت پنجاب نے اس پروگرام کو مکمل طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یوں جنوبی پنجاب کے مرکز ملتان میں یہ پروگرام بھی شروع نہیں کیا جاسکے گا اور یہاں کے مال پال اس کے ثمرات سے مستفید نہیں ہو پائیں گے۔

اس صورتحال میں ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت زمینی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے پراجیکٹس تشکیل دے جن کے دور رس فوائد حاصل ہو سکیں۔ کوئی بھی منصوبہ مخصوص علاقے یا لوگوں کے لیے نہیں ہونا چاہئے۔ حکومت کو اس حوالے سے بھی سوچنا چاہئے کہ لائیوسٹاک ایسا ادارہ ہے جو ملک میں پہلے سے موجود ہے اور جس کا وسیع نیٹ ورک 50 برس سے قائم ہو چکا ہے اس کے ذریعے ہی نئے منصوبے شروع کئے جائیں کیونکہ مذکورہ بالا بیان کردہ منصوبوں پر حکومت نے اربوں روپے خرچ کئے مگر مطلوبہ نتائج ابھی تک سامنے نہیں آ سکے اور ملک میں اب بھی دودھ

اور گوشت کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا بلکہ جن علاقوں میں پہلے دودھ اور گوشت کی پیداوار زیادہ تھی، ان پر اچیکٹس کے شروع ہونے کے بعد زیادہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ محکمہ لائیوسٹاک کے وسیع نیٹ ورک سے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک میں دودھ اور گوشت کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔

کارپوریٹ فارمنگ، ایک اور غیر مقبول فیصلہ

ایک ایسے وقت میں کہ جب خوراک کا بڑھتا ہوا بحران پوری دنیا کو لپیٹ میں لے رہا ہے، حکومت پاکستان مبینہ طور پر لاکھوں ایکڑ اراضی کارپوریٹ فارمنگ کی غرض سے بعض خلیجی ممالک کو فراہم کر رہی ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا کے امیر ترین ممالک کھانے پینے کا سامان اکٹھا کرنے کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ ان ممالک میں غذائی ضروریات اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ ان کی اپنی زمینیں انھیں پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ دراصل کسی ملک میں زمین زرخیز نہیں اور کہیں پانی کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ ان کے پاس دوسرے ممالک سے غذائی سامان خریدنے کے لیے بجٹ نہیں۔ پچھلے 62 سالوں سے پاکستان کا حکمران طبقہ ملک کے مزدوروں اور کسانوں کی زندگیوں میں کوئی بہتری لانے کے بجائے ہمیشہ ایسے اقدامات اٹھاتا رہا ہے جن سے ان کے لیے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا اور زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی ہی ایک نئی افیت کارپوریٹ فارمنگ کی شکل میں سامنے آئی ہے جس سے لاکھوں کسانوں، ہاریوں اور کھیت مزدوروں اور ان کے خاندانوں کی زندگیاں داؤ پر لگ چکی ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ اپنی سرزمین کو غیروں کے ہاتھوں بیچنے کے منصوبے کا آغاز پرویز مشرف کے دور میں کیا گیا۔ غیر ملکی حکومتوں اور پاکستان کے سرمایہ کاری بورڈ کے درمیان زمین پٹے پر لینے، دینے کے لیے ہونے والے روابط کی بنیاد 2002ء میں بننے والا کارپوریٹ فارمنگ ایکٹ ہے جس کے تحت حکومت کسی بھی غیر ملکی فرد یا کمپنی کو ملک کے چاروں صوبوں میں زرعی زمین آسان شرائط اور پرکشش مراعات پر زرعی استعمال کے لیے فروخت کرنے یا پٹے پر دینے کی مجاز ہے۔ اس میں زمین لیز پر دینے یا فروخت کرنے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے اور پاکستان کے غریب

کسانوں، ہاریوں اور کھیت مزدوروں کی تمام تر مخالفت اور احتجاج کے باوجود وزارت خوراک و زراعت کی طرف سے تیار کردہ کارپوریٹ فارمنگ کی پالیسی وفاقی کابینہ نے منظور کر لی۔

موجودہ حکمرانوں کے دور میں اس عمل میں مزید تیزی آگئی ہے اور اس نے سرمایہ کاروں کے لیے مزید مراعات کا اعلان کرتے ہوئے عرب ممالک کو 6 ملین ایکڑ اراضی کی پیشکش کی ہے۔ سرمایہ کاری کا مقصد عرب ممالک کی خوراک کی ضروریات پوری کرنا ہے اور زرعی اجناس کی بین الاقوامی منڈیوں سے ہٹ کر پسماندہ ممالک کی زمینوں کو اپنی خوراک کی پیداوار کے لیے استعمال کرنا ہے۔ بحرین، قطر، کویت، عرب امارات اور سعودی عرب جیسے ممالک میں اشیائے صرف کی منڈی پر جن کمپنیوں کا تسلط ہے وہ اسے جاری رکھ کر بڑے پیمانے پر کاشتکاری کرنا چاہتی ہیں تاکہ پیداوار کو براہ راست منڈی میں پہنچایا جاسکے ورنیکسوں کی چھوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکے۔

پالیسی بیج کے تحت ملکی زمینیں 99 سال تک لیز پر دینے کا اعلان کیا گیا ہے جس میں سرمایہ کار کو تمام پیداوار اور منافع اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو ارب ڈالر کی لاگت سے ایک لاکھ افراد پر مشتمل خصوصی سیکورٹی فورس بنانے کا بھی اعلان کیا گیا ہے جو اس سرمایہ کاری کی حفاظت کرے گی۔ اس طرح زمین کی ملکیت کم از کم ایک ہزار ایکڑ مقرر کی گئی ہے جبکہ زیادہ سے زیادہ حد پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ زمین کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد کے قانون میں تبدیلی کی گئی ہے جسے 1977ء میں سوا ایکڑ مقرر کیا گیا تھا۔

خلیج کے ذرائع ابلاغ کے مطابق امارات انویسٹمنٹ اور دیگر گروپس نے اس وقت پاکستان میں آٹھ لاکھ ایکڑ سے زائد زمین زرعی مقاصد کے لیے حاصل کر لی ہے۔ اسی طرح سعودی عرب سے بھی

مذاکرات جاری ہیں جبکہ قطر کی حکومت اپنے ملک کی خوراک کی پیداوار مکمل طور پر پنجاب میں منتقل کر رہی ہے۔ اس عمل کے دوران یہاں کم از کم 25 دیہات جبکہ لاکھوں کسان زمین سے بے دخل ہو کر بیروزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔ اسی طرح متحدہ عرب امارات کی حکومت یہاں بلوچستان کی حکومت سے مذاکرات کر رہی ہے تاکہ میرانی ڈیم کے قریب 3 لاکھ 70 ہزار 1657 ایکڑ زمین حاصل کر سکے۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق متحدہ عرب امارات کی حکومت پہلے ہی 40 ہزار ایکڑ کے لیے 4 کروڑ ڈالر دے چکی ہے جو ہزار ڈالر فی ایکڑ بنتا ہے۔ اسی طرح ایک اور کمپنی قطر لائیو سٹاک پاکستان میں ایک ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کر چکی ہے۔ سندھ حکومت سے بھی مذاکرات چل رہے ہیں تاکہ شکار پور، ٹھٹھہ، بدین اور سکھر کے قریب زمینیں حاصل کی جاسکیں۔ جبکہ پنجاب حکومت میانوالی، سرگودھا، خوشاب، جھنگ اور فیصل آباد کے قریب ہزاروں ایکڑ زمین کارپوریٹ فارمنگ کے لیے دینے کے لیے مذاکرات کر رہی ہے۔ وزارت خوراک و زراعت نے سرمایہ کاری بورڈ کے ذریعے ملک کے چاروں صوبوں میں ایسی 81 لاکھ، ہیکٹر قابل کاشت زمین کی نشاندہی کی جو تاحال زیر کاشت نہیں لائی آج سکی۔ اس میں سے 48 لاکھ، ہیکٹر بلوچستان کے قلات، کوئٹہ، نصیر آباد، مکران ڈویژن میں واقع ہے۔ پنجاب میں یہ زمین ڈیرہ غازی خان، بہاولپور، راولپنڈی اور لاہور، صوبہ سندھ میں حیدر آباد، میرپور خاص سکھر اور لاڑکانہ میں ہے جبکہ صوبہ سرحد میں ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ اور کوہاٹ کے علاقے شامل ہیں۔

سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں کارپوریٹ فارمنگ کا جو منصوبہ بن رہا تھا اس میں چین کو زمین لیز پر دینے کی بات ہو رہی تھی۔ چینی حکومت کا کہنا تھا کہ وہ دو ہزار ایکٹر اراضی دس سے پندرہ برس کے لیے لیز پر لے گی اور بدلے میں چین یہاں کے زرعی سیکٹر کو مالی اور تکنیکی مدد فراہم کرے گا۔ اس طرح وہ جو انفراسٹرکچر قائم ہوتا معاہدہ ختم ہونے کے بعد پاکستان کی ملکیت ہو جاتا۔

یہ ایک اچھا منصوبہ تھا جو دونوں ممالک کے مفاد میں تھا۔ پھر حکومت میں شامل بعض افراد نے معاملے میں کچھ تبدیلیوں کی تجویز دی۔ مثال کے طور پر سرمایہ کار اس طرح معاہدے کریں کہ مقامی لوگوں کا زمین پر حق ملکیت متاثر نہ ہو اور سالانہ منافع میں بھی انھیں کچھ حصہ ملے گا۔ پھر سرحد کے بعض علاقوں میں کارپوریٹ فارمنگ پر باقاعدہ کام شروع ہو گیا تھا۔ اس حوالے سے چینی فرم نے ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں، لاپچی اور کوہاٹ میں منصوبہ شروع کر دیا تھا۔ بعد ازاں مقامی کاشتکار حلقوں کی مخالفت کے بعد کام روک دیا گیا۔ ایسی ہی بہت سی تفصیلات کو ذرائع ابلاغ سے چھپایا جا رہا ہے جبکہ حکومتی اہلکار اس مسئلے پر کھل کر بات کرنے سے گریزاں ہیں۔

سی آر ایس ڈی اور ایکشن ایڈ پاکستان کسان تنظیموں اور کاشتکاروں کے ساتھ مل کر کارپوریٹ فارمنگ کے منفی اثرات کے حوالے سے کام کر رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو مراعات بیرون ممالک کی کمپنیوں کو دی جا رہی ہیں، وہ یہاں کے کسانوں اور کاشتکاروں کو دی جائیں اور لاکھوں ایکڑ زمین جو بیرون ممالک کی کمپنیوں کو لیز پر آسان شرائط اور مراعات کے ساتھ دی جا رہی ہے یہ زمینیں یہاں کے کسانوں اور کاشتکاروں میں تقسیم کریں اور انھیں مراعات دی جائیں تو پاکستان میں جلد خوراک اور زرعی میدان میں انقلاب برپا ہو گا۔

2000ء کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کی 37 فیصد دیہی آبادی زمین کی مالک ہے۔ ان میں سے 61 فیصد کے پاس پانچ ایکڑ سے بھی کم زمین ہے جبکہ ملک کے چھ فیصد بڑے جاگیر دار 60، ہیکٹر سے زائد زمین کے مالک ہیں۔ اس غیر منصفانہ تقسیم کی بنا پر ملک میں جاگیر دارانہ نظام مضبوط ہے۔ اگرچہ زرعی جائیداد کی نسل در نسل منتقلی یا تقسیم سے یہ نظام کمزور ہو رہا ہے لیکن کارپوریٹ فارمنگ جیسے منصوبے سے جاگیر دارانہ نظام کو تقویت ملے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام میں بڑے

زمیندار تو کسان کے ساتھ شراکت داری کی بنیاد پر کاشت کاری کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ملک میں چھوٹے اور غریب کسان کا کس طرح استحصال کیا جا رہا ہے۔ کارپوریٹ فارمنگ کے متعلق حتمی قانون سازی کے بعد ملک کے بڑے کاشتکاروں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی جائیداد کو کارپوریٹ فارمنگ کے تحت رجسٹرڈ کروالیں۔ ایسا ہونے کی صورت میں نا صرف متعلقہ زرعی اراضی پر صدیوں

سے کھیتی باڑی کرنے والے کسان بے دخل ہو جائیں گے بلکہ جائیداد اور زرعی اصلاحات سے بھی بچ جائیں گے۔

نئی کار آمد تحقیق

سائنس میں اس موجودہ دور میں حیرت انگیز دریافتیں ہو رہی ہیں۔ ایک خاندانی مسئلہ جس سے بہت سے خاندانوں کے کافی افراد اثر انداز ہوتے ہیں، وہ ہے موٹاپا۔ یہ ذیابیطس، دل کی بیماریوں اور دیگر بیماریوں کی جڑ ہے۔ عالمی ادارہ برائے صحت کے مطابق دنیا کی ایک تہائی آبادی اس موٹاپے کے مرض میں مبتلا ہے۔ یعنی تقریباً دو ارب سے زائد افراد اس کا شکار ہیں۔ اس کی کئی وجوہات دریافت کی گئی ہیں جن میں جنیاتی، ماحولیاتی اور متعدی عوامل شامل ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ موٹا پانچ خاندانوں میں چلتا ہے یعنی اگر والدین موٹے ہیں تو ان کے بچے بھی زیادہ تر موٹے ہی ہوتے ہیں۔ موٹاپے کا جین (جسے FTO بھی کہتے ہیں) اب سے کچھ ہی سال پہلے دریافت ہوا ہے اور 16 فیصد یورپیوں میں یہ پایا گیا ہے۔ ایک اور وجہ جس سے موٹاپے کا تعلق ہے وہ ہے نیند کی کمی۔ حیرت کی بات ہے کہ جب کوئی جاگ رہا ہوتا ہے تو وہ زیادہ حرارے استعمال کر رہا ہوتا ہے یہ نسبت سوتے ہوئے۔

امریکہ کے ایک ادارے نے اپنے ایک مطالعے کے دوران جس میں 87,000 امریکی شامل تھے دریافت کیا کہ موٹاپے کا تناسب ان لوگوں میں زیادہ پایا گیا جو کہ دن بھر میں چھ گھنٹے سے کم نیند لیتے تھے یہ نسبت ان لوگوں کے جو دن بھر میں 6-9 گھنٹے کی نیند پوری کرتے تھے۔ نیند کی کمی کی وجہ سے بھوک لگنے والے ہارمونز ghrelin اور leptin میں بے ترتیبی کے نتیجے میں زیادہ بھوک لگتی ہے اور نمکین میٹھی غذا کی طرف رغبت بڑھ جاتی

ہے۔ موٹاپے سے متعلق ایک اور دلچسپ دریافت یہ ہے کہ موٹے بچوں اور بڑوں میں ایک مخصوص وائرس (Adeno virus 36) دریافت ہوا ہے۔ یہ وائرس مرغیوں اور جانوروں میں

بھی شرح تحول کو مست کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ موٹے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے دیگر محرکات بھی شناخت ہوئے ہیں جن میں ایک مرکب BPA (Bisphenol A) ہے جو کہ کھلونوں، پلاسٹک لفافوں، دانت برش اور پلاسٹک کی پانی کی بوتلوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہ مرکب قدرتی ہارمون ایسٹروجن کی نقل کر سکتا ہے اور اس طرح فربہی نظام ادا اور تحول کو بے ترتیب کر سکتا ہے۔ بہت سے لوگ پرہیزی مشروبات لیتے ہیں یہ سوچتے ہوئے کہ اس میں کم حرارے ہوں گے اور یہ انھیں ڈبلا کرنے میں مدد دیں گے لیکن حیرت انگیز دریافت یہ ہے کہ وہ مشروبات جن میں مصنوعی مٹھاس ہوتی ہے وہ دراصل آپ کو مزید موٹا کرتے ہیں۔ امریکن محققین Terry Davidson اور ان کے ساتھی یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ جب مصنوعی مٹھاس والی غذا چوہوں کو دی گئی تو ان کا وزن بڑی تیزی سے بڑھا۔ یہ دریافت ہوا کہ اس مصنوعی مٹھاس کی وجہ سے ہمارے جسموں میں قدرتی حرارے ناپنے کا نظام بے ترتیب ہو جاتا ہے نتیجتاً غذا کی طلب بڑھ جاتی ہے اور کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے۔ ایک اور حیرت انگیز بات پتہ چلی ہے کہ چربی کا کم کرنا بھی چربی ہی کی ایک قسم سے ممکن ہے۔ یعنی کتھی چربی۔ اس چربی کی خاصیت یہ ہے کہ یہ خاص چربی حرارے جلانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے لہذا جو غذا ہم کھاتے ہیں اسے فوری استعمال کرتے ہوئے حرارت میں تبدیل کرتی ہے۔ تقریباً 50 گرام کتھی چربی 500 حرارے بغیر کسی ورزش کے جلانے کے لیے کافی ہے۔ اس کتھی چربی کے خلیوں میں ایک خاص پروٹین ہوتا ہے جو غذا کو حرارت میں تبدیل کرنے میں مدد دیتا ہے جبکہ یہ خاص پروٹین عام چربی میں نہیں ہوتا۔ کتھی چربی کچھ لوگوں میں موجود ہوتی ہے۔ لہذا یہ بات اب سمجھ میں آگئی ہے کہ کیوں کچھ لوگ موٹے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ دبلے جبکہ دونوں ایک ہی مقدار کے حرارے لے رہے ہوں۔ کتھی چربی چھوٹے

بچوں میں زیادہ مقدار میں ہوتی ہے جو کہ عمر کے ساتھ ساتھ کم ہو جاتی ہے اور 40 سال کی عمر میں یہ مکمل طور پر غائب بھی ہو سکتی ہے۔

اس چربی کو کسی طرح محفوظ کرنے کے لیے بھی تحقیق کی جا رہی ہے۔ بہت سی کمپنیاں بھوک نہ لگنے کی دوائیاں تیار کر رہی ہیں لیکن ان سب کے مضر اثرات ہیں۔ لہذا موجودہ صورت حال میں وہی پرانا طریقہ یعنی ورزش اور اس کے ساتھ غذا پر قابو ہی اس موٹاپے سے نجات کا حل ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ کھانے جن میں ریشہ ہوتا ہے صحت کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں کیونکہ انھیں ہضم کرنے کے لیے زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجتاً کم حرارے حاصل ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح موٹے درد رے آٹے کی روٹی ہضم دیر سے ہوتی ہے اور تقریباً 30 فیصد سے زیادہ خوراک بغیر ہضم ہوئے فضلہ بن کر نکل جاتی ہے بہ نسبت اس روٹی کے جو کہ باریک پسے ہوئے آٹے سے تیار کی جائے۔ مراکمی اور ان کے ساتھیوں نے جامعہ ٹوکیو میں 540 خواتین کا سروے کیا تو ان خواتین کی کمریں کم ناپ کی تھیں جو سخت کھانا کھاتی تھیں۔ ان خواتین کی نسبت جو نرم غذا کھاتی تھیں (با آسانی زود ہضم)۔ غذا میں اعتدال برتنے کے بہت سے فوائد ہیں ان میں سے ایک لمبی عمر بھی ہے۔ اس کا مشاہدہ مٹی میں رہنے والے کیڑوں مکھیوں، چوہوں اور بندروں میں کیا گیا ہے۔ Richard Weindruch اور ان کے ساتھیوں نے بندروں پر 20 سال پر محیط ایک تجربہ کیا تھا جس میں بندروں کو 30 فیصد کم حرارے والی غذا دی گئی اور ان کی عمریں دوسرے عام بندروں سے قدرے طویل نکلیں۔

Charles Mobbs اور ان کے ساتھیوں نے ایک مطالعے میں کم غذا کھانے اور لمبی عمر سے تعلق کا مشاہدہ کیا ہے اور وجوہات سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا یہ ثابت ہوا کہ زیادہ غذا کھانے سے

آکسائیڈ (oxidative) توڑ پھوڑ کی وجہ سے عمر کم ہوتی ہے۔ گلوکوز محلول کی وجہ سے خلیوں پر دباؤ پڑتا ہے اور خلیوں کی تیزی سے توڑ پھوڑ سے کینسر بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے نجات پانے کے لیے غذا کم کھانے سے خلیوں کے افعال کو (کچھ چیز کی مدد سے) بہتر کیا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زیادہ بھوکے رہنے سے بھی زندگی کا دورانیہ لمبا نہیں کیا جاسکتا بلکہ کم کھانے سے یہ ممکن ہے۔ ایک سوسائٹی جس کے تین ہزار رکن ہیں (جنہیں CRONIES بھی کہتے ہیں) یہ لوگ محدود حراروں پر بنی سبزیوں پر مشتمل متوازن غذا کو ترجیح دے رہے ہیں اور نتیجہ صحت مند فوائد۔ جامعہ واشنگٹن کے ایک پروفیسر کے مطابق اس سوسائٹی کے اراکین کے دل 15 سال کم عمر پائے گئے جب ان کا موازنہ ان ہی کی عمر کے دوسرے امریکیوں سے کیا گیا۔ ہمارے مذہب میں کم کھانے کی ترغیب دی گئی ہے اور جدید سائنس بھی اس مشورے کی تقلید کر رہی ہے۔

جن تحقیقات کا یہاں ذکر ہوا ہے وہ مغرب کی جامعات اور تحقیقی اداروں میں ہوئی ہیں۔ یہ سب کام پاکستان میں بھی ممکن ہے اگر ہمارے تحقیقی ادارے مضبوط ہوں۔ پاکستان میں ہماری جامعات میں بڑی ضوفشاں تبدیلیاں رونما ہوئیں بالخصوص اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے قیام کے پہلے چھ سالوں میں 2002ء سے 2008ء تک۔ سب سے زیادہ توجہ اساتذہ کی تربیت کو دی گئی لہذا ہزاروں ذہین طلبہ کو تربیت اور تعلیم کے لیے یورپ اور امریکہ کی سب سے عمدہ جامعات میں بھیجا گیا۔ وہ اب وہاں سے لوٹ آئے ہیں اور نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اعلیٰ بین الاقوامی تحقیقی جریڈوں میں 200ء میں شائع ہونے والے 700 تحقیقی مقالے فی سال کی تعداد اب بڑھ کر 2013ء میں 9000 اشاعت فی سال ہو گئی ہے جو کہ بھارت کی فی لاکھ آبادی کی تحقیقی اشاعت کے تناسب سے زیادہ ہو گئی ہے۔ موجودہ حکومت کو چاہئے کہ ایچ ای سی کے چیئرمین کے لیے بین الاقوامی شہرت یافتہ شخص جو کہ بہترین انتظامی امور اور عمدہ قیادت کی خوبیوں کا حامل ہو اس کا انتخاب کرے تاکہ وہ

انقلاب جو 3003ء میں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں آنا شروع ہوا تھا اسے جاری رکھا جاسکے اور پاکستان بھی حیاتیاتی سائنس اور دیگر شعبوں میں ترقی کرے جس کا براہ راست اثر صحت، زراعت اور انجینئرنگ پر پڑتا ہے۔ اس طرح سماجی و اقتصادی ترقی کے عمل کو تیز کیا جاسکتا ہے۔ ایچ ای سی کے قانون میں یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ اس کا چیئر مین تحقیق کی بنیاد پر عالمی شہرت کا حامل ہو۔ موجودہ حکومت کو چاہئے کہ سیاسی بنیاد پر تقرری نہ کرے بلکہ قانون کی اس شق کا احترام کرے۔

ذاتیات، غذائیات، حیوانیات، ماحولیات، سیاسیات، مزاحیات اور ادبیات پر مبنی ایک بے مثال فکری مسافت

فکرِ سلطان

ڈاکٹر سلطان محمود



5

سیریز پنجم: غذائی تحفظ

ڈاکٹر سلطان محمود نے سائنسی انداز میں تحریکی کارکن بن کر غذائی تحفظ کی عالمی خود مختار تحریک کو مقامی رہنما کے طور پر پاکستان میں ایک غیر معمولی موڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں ان کے افکار اور عملی جدوجہد نے "فکرِ سلطان" جیسی ایک طاقتور دستاویزی سیریز جنم دی ہے۔ اس میں وہ اپنی آدھی صدی کی شبانہ روز کوشش کو شاندار کہانی کے طور پر بیان کرتے ہوئے اہم معلومات سے بھری وہ تاریخ بھی بیان کر رہے ہیں جو ملک عزیز کے غیر مستحکم حالات کے باوجود مقامی اور چلی سطح کے مسائل کو قومی اور عالمی سطح پر کچھ اس انداز سے اٹھا لے جاتے ہیں کہ جہاں وہ حیاتیاتی تنوع یا بائیو ڈائیورسٹی کی بنیت تبدیل کئے بغیر کارپوریٹ تسلط کے ساتھ جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ڈیپلمنٹ مافیا کے خلاف کس طرح چلی سطح کی لڑائی کو اٹھا کر قومی اور عالمی سطح پر لے جایا جاتا ہے۔ ان کی یہ سوچ بھی قابلِ داد ہے کہ دنیا بھر میں مقامی سطح کی کمیونٹی ہمیشہ مقدس اور خود مختار ہونی چاہئے تاکہ وہ اپنے علم اور حقوق کو حاصل کر کے مستقبل کی دنیا کی حقیقی کہانی کا نقشہ ترتیب دے سکے۔



ڈاکٹر سلطان محمود
مفکر، محقق اور نقاد

“فکرِ سلطان” کی
تمام سیریز
آن لائن دیسپل
موجود ہیں



ملفوظات، غذائیات، حیوانیات، ماحولیات، سیاسیات، مضحکات اور ادبیات کے امتزاج کا ایک شاندار فکری سفر



ڈاکٹر سلطان محمود، مینیجنگ ڈائریکٹر، ایکو کیئر کنسلٹنسی سروسز، لاہور۔ بانی انوائزمنٹ کنسلٹنٹس ایسوسی ایشن پاکستان؛ سوسائٹی آف اینیمیل سائنسز اور ایگزیکٹو پاکستان اکیڈمی آف فیملی فریڈیشنرز